تحفۂ ادب

مرتبہ

آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے
ڈون اسکول ڈیرہ دون

حسب فرمائش

ایس، چند اینڈ کمپنی تاجران کتب
چاندنی چوک۔ دھلی

بار اوّل

[illegible]

مطبوعہ
جید برقی پریس بلیماران اسٹریٹ
دہلی

فہرست مضامین

حصّہ نثر

بدقسمتی سے ہندوستانی زبانوں کو معیار اور ان کی اہمیت کو ہمارے تعلیمی پروگرام میں ایک مدت تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ طالب علم کے ذہن میں اپنی مادری زبان کا وہ وقار قایم نہیں ہو سکتا جس کی کہ یہ بجا طور پر حقدار ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سکولوں میں ہندوستانی زبانوں کے مدرّسین کی کس مپرسی ایک ایسی عالم آشکار حقیقت ہے کہ ناواقف سے ناواقف طالبعلم بھی ان کی بے چارگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا اثر زبان کی تعلیم وتدریس پر بھی پڑتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے ملک میں ہر کونے سے ہندوستانی زبانوں کی بہتری کے لئے مسلسل جدّوجہد ہو رہی ہے۔ اور بعض یونیورسٹیوں نے تو یہاں تک قبول کر لیا ہے کہ آئندہ ثانوی جماعتوں تک ذریعہ تعلیم ملکی زبانوں کو قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں ملکی زبانوں کا درجہ اور وقار بڑھانے کے لئے بھی بہت سی بارآور کوششیں ہو رہی ہیں جس سے اب یہ امید بندھ چلی ہے کہ اگر ترقی کی یہی رفتار قایم رہی تو وہ دن دور نہیں جب کہ ہماری ملکی زبانوں کو بھی غیر ملکی زبانوں جیسی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔

میرا ذاتی طور پر یہ خیال ہے کہ طالب علم کی دلچسپی اور توجہ قایم رکھنے میں سب سے بڑی ذمہ داری استاد پر عائد ہوتی ہے۔ یہ مانا کہ خدا وندانِ نعمت کا سلوک ملکی زبانوں کے استادوں سے حد درجہ دل شکن اور ناروا ہے۔ لیکن ایک استاد ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری اسی حد تک ختم نہیں ہوتی کہ اپنے حقوق کے لئے رقص بسمل کریں اور خاموش ہو جائیں۔ جماعت میں اپنے مقررہ اوقات پر درس دیں اور اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھالیں کہ ہمارا کام ختم ہوگیا۔ غالباً اِس امر کے اعتراف میں سب اساتذہ اور تعلیم کے ماہر میرے ہم نوا ہونگے کہ معلّمی کا پیشہ دنیا میں ہر جگہ معاوضہ کے اعتبار سے بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ لیکن معلّم کا سماج پر اثر اور اس کی تعمیر و تشکیل میں زبردست حصّہ میرے خیال میں اس کے معاوضہ سے کہیں زیادہ ضروری عناصر ہیں کہ جن پر ہر معلّم کو اپنے لمحاتِ فرصت میں غور کرنا لازم ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے ملکی زبانوں کے معلّم کی ذمہ داری اور فرائض دوسرے معلّموں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو اس بات پر غور کیجئے کہ ہم ملکی زبانیں کیوں پڑھاتے ہیں۔ ملکی زبان کا صرف ایک معمولی مضمون کی حیثیت سے پڑھانا کوئی ایسا بہت بڑا فرض نہیں ہے کہ جسے ادا کرنے کے بعد ہم بالکل مطمئن ہو جائیں۔ ملکی زبان پڑھانے کا سب سے بڑا مطلب اپنے ملک کی گذشتہ روایات اور قدیم تہذیب کو قایم رکھنا اور شاندار مستقبل کی جدّوجہد کے لئے طلباء کو تیّار کرنا ہے۔ جس طرح کوئی پرندہ مانگے ہوئے پروں سے قوت پرواز حاصل نہیں کرسکتا۔ بالکل اُسی طرح کوئی قوم یا کوئی ملک غیر زبان کے ذریعہ اپنے خیالات میں تازگی، عمل میں قوت اور ارادے میں استحکام پیدا نہیں کرسکتا

گویا ہندوستانی زبانوں کے استاد کا فرض زبان سکھانے کے علاوہ ملکی اور قومی جذبات کی تعمیر اور پرورش کرنا بھی ہے۔

مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ ایک ذہین اُستاد ان زبانوں میں بھی طلباء کے لئے وہی دلچسپی اور جاذبیت کے سامان پیدا کر سکتا ہے کہ جن کے فقدان سے اب تک ان زبانوں کو نقصان پہنچتا رہا ہے۔

اِس انتخاب کے ایک ایک سبق کو میں نے اپنی جماعتوں کو سنایا ہے اور مختلف معیار کے طلبار کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر انہیں جانچا ہے۔ میرا سب سے بڑا مقصد اس نصاب کی ترتیب میں یہ ہے کہ طلبا بیک وقت جماعت میں دلچسپی بھی قایم رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس حد تک زبان بھی سیکھ جائیں کہ بغیر کسی دقت کے اُردو ادب کا مطالعہ کر لیں۔ بے جھجک اس زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں۔ اور ہمارے ادب کے مختلف اصناف اور ادوار کے ممتاز مشاہیر کے کلام اور طرز انشاء سے بخوبی واقف ہو جائیں چنانچہ زیر نظر نصاب میں ہر مصنف کا ایسا انتخاب شامل کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد اُس مصنّف کی تمام خوبیاں۔ اور طرزِ بیان کی باریکیاں طالبِ علم پر آئینہ ہو جاتی ہیں۔

حصہ نثر میں قدیم مصنفوں کے دوش بدوش موجودہ دَور کے خان بہادر میرزا محمد علی دہلوی۔ پنڈت برج نرائن چکبست اور مرزا فرحت اللہ جیسے ممتاز اہل قلم اور صاحب طرز انشا پرداز بھی نظر آئیں گے۔ انتخاب مضامین میں اگر ایک طرف میرامّن کی زبان سے کوئی درویش اپنا قصہ سناتا ملے گا تو اس کے بعد طلبار کو غیر شعوری طور پر ادبی تنقید سے روشناس کرانے کے لئے حالی، مرزا غالب کے خطوں پر تنقید کرتے نظر آئیں گے۔ سرشار اور شرر

جہاں لکھنؤ کے بانکوں اور لکھنؤ کے رکاب داروں کی دلچسپ داستان سنائیں گے۔ وہیں آزاد کا معجز نگار قلم دربار اکبری سجاتا ملیگا۔ غرض اس گلدستہ کو رنگ رنگ کے پھولوں اور وضع وضع کے بوٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اور امید ہے کہ اس ایچ کو اہلِ نظر پسند کریں گے۔

اب تک ہمارے اُستادوں کو اس بات کی شکایت ہے کہ طالب علم زبانوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان دینے کے بعد بھی اصنافِ نظم کی تعریف سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اگر ان سے قصیدہ اور رباعی میں فرق پوچھا جائے تو جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا حل یہ سمجھ میں آیا ہے کہ حصہ نظم کی ترتیب اصنافِ نظم کے اعتبار سے کی جائے۔ تاکہ کم از کم ایک صنف کے اشعار پڑھتے پڑھتے طالب علم اُس صنف سے واقف ہو جائے۔ اور مدرسین کی امداد کے لئے ہر صنف شعر کے انتخاب سے قبل اُس کی مجمل تعریف بھی کر دی ہے امید ہے کہ طالب علموں کو اگر یہ تعریفیں ذرا وضاحت اور شوق سے بتائی گئیں تو آئندہ چل کر عروض و قوافی اور دوسرے نکتے بھی ان کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں گے۔

حصہ نثر کی طرح حصہ نظم میں بھی قدیم اساتذہ کے پہلو بہ پہلو جدید اُردو شاعری کے اقبال اور جوش جیسے علم بردار نظر آئیں گے۔ حالی کے مسدس کا انتخاب طالب علموں کو اسلام کی تعلیمات سمجھا دے گا اور حالی کی طبیعت کا خلوص اور معجز بیانی طلبا پر اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔ انہوں نے جن الفاظ میں گذشتہ عظمت کی یاد دلائی ہے۔ یا ہماری موجودہ نکبت پر آنسو بہائے ہیں یہ بجائے خود ایک بڑی تعلیم ہے۔ اکبر نے مزے لے لے کر جو میٹھی میٹھی چٹکیاں لی ہیں اُن کا درس پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں کے

لئے ایک جیسا دلچسپ ہے۔ اقبال کا فلسفیانہ بیان اگرچہ طلباء کے لئے کافی گنجلک پیدا کر سکتا ہے لیکن قومیت اور وطنیت کی تعلیم کا ذریعہ ان سے بہتر ملنا مشکل ہے۔

چکبست نے قدیم شاعری اور نئے خیالات کو ایک جگہ سمو دیا ہے۔ ان کی زبان سے رامائن کی کتھا قومیت کے نظریہ کی نشوونما کا ایک ضروری جزو بن گئی ہے۔

اپنا بیان ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انتخاب کے ہر مضمون کو سبقاً سبقاً پڑھانا ضروری نہیں ہے۔ اکثر مضامین کو حاشیہ کی مدد سے طلباء خود پڑھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اُستادوں کی وہ شکایت ایک حد تک دور ہو جاتی ہے کہ محدود وقت کے اندر نصاب ختم کرانا ضروری ہے۔ اس لئے کسی اور بات کا وقت ہی نہیں ملتا۔

ایک اچھے اسکول کے لئے عمدہ لائبریری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور لائبریری بھی ایسی لائبریری کہ جس کی کتابیں صرف الماری کی زینت ہی نہ ہوں بلکہ واقعی طلباء اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لائبریری کی کتابوں کا انتخاب زیادہ تر طلباء کے رجحان اور استاد کی دلچسپی پر منحصر ہے لیکن کم از کم اُن مصنفوں کی تمام تصانیف ہونی چاہئیں کہ جن کے انتخابات اس نصاب میں شامل ہیں۔ اس طرح طلباء ان انتخابات کو پڑھنے کے بعد انہی مصنفوں کی دوسری کتابیں بھی پڑھ سکیں گے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر ہفتہ میں ایک گھنٹہ صرف لائبریری کے لئے وقف کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلتا ہے۔

استاد اپنی نگرانی میں ہر ایک طالب علم کے لئے اس کے مذاق اور معیار کے مطابق کتاب تجویز کرے اور پھر اُس مضمون کے متعلق بعد میں سوالات کے

جوابات لکھوا کر یا سُن کر اطمینان بھی کر لے کہ طلباء اِس گھنٹے سے جائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

طلباء کی دلچسپی اور مذاق کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے ادبی حلقے یا انجمنیں بھی بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی انجمنوں اور مجلسوں میں طلباء کو ملکی زبان میں بولنے چالنے اور تقریر کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے جو تعلیم کافی زمانہ ایک ضروری جز و سمجھا جاتا ہے۔ اگر طلباء کا شوق اور زیادہ ہو اور اسکول کی مالی حالت اجازت دے تو ایک چھوٹا سا سالانہ یا حالات مساعد ہونے کی صورت میں شش ماہی رسالہ بھی طلباء کی دلچسپیوں اور دائرہ عمل کو وسیع تر کر دیتا ہے۔

خوش قسمتی سے میرا تجربہ ایسے لڑکوں کے متعلق ہے جو اُردو بہت کم جانتے ہیں اُن کے گھر میں عام طور پر انگریزی بولی جاتی ہے۔ اور شروع میں انہیں اُردو زبان سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ میرے لئے ایک وقت میں دو سوال تھے۔ ایک تو زبان سکھانا اور دوسرے اس میں دلچسپی پیدا کرنا۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اِن میں سے اکثر لڑکوں کا اردو ادب کی طرف صرف رجحان ہی نہیں ہوا بلکہ عملی طور پر وہ اسکول کی مجلس۔ اسکول کے اُردو میگزین اور دوسری ادبی دلچسپیوں میں عملی حصہ لینے لگے۔ گذشتہ سال ہم سب نے مل کر ایک اُردو کا دلچسپ رسالہ شائع کیا جس میں تمام تر مضامین طالب علموں کے تھے۔ اس کے علاوہ ہماری مجلس کے جلسے بہت دلچسپ ہوتے ہیں جس میں تقریباً ہر ہندی اور اُردو پڑھنے والا باقاعدہ حصہ لیتا ہے۔ گذشتہ فروری ۱۹۳۸ء میں ہماری مجلس نے "یوم غالب" بہت

دلچسپ انداز میں سنایا اور اس موقع پر طالب علموں نے غالب کے متعلق جو تقریریں کیں یا مضمون پڑھے وہ بہت ہمت افزا تھے۔

سب سے آخر میں گھر کے کام والے مسئلہ پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جس طرح جماعت میں طلبار کی توجہ کو جذب کرنا استاد کا کام ہے۔ بالکل اتنا ہی ضروری بلکہ شاید اُس سے زیادہ اہم سوال فرصت کے اوقات کو استعمال کرانا ہے۔

عام طور پر استاد گھر کا کام اسقدر غیر دلچسپ اور خشک قسم کا دیتے ہیں کہ طالب علم اُسے ایک ناگوار فرض سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ لیکن یہی چیز ایک ایسی دلچسپ اور مفید بنائی جاسکتی ہے کہ جس کو طالب علم واقعی خوشی سے کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مثلاً مشکل الفاظ کے معنی لکھنے یا شہر اور دیہات کی زندگی کا مقابلہ کرانے کی بجائے سال کے شروع میں استاد اُن تمام دلچسپ مضامین کا ایک نقشہ تیار کر سکتا ہے کہ جنہیں ہر طالب علم کو لکھنا ہے۔ اور ہر مضمون کے سامنے اس کے متعلق کتابوں کی فہرست بھی تجویز کر سکتا ہے۔ اب ہر طالب علم کو اختیار ہے کہ ان مضامین میں سے جو مضمون چاہے پہلے انتخاب کرلے اور ہر ہفتہ استاد کو دکھاتا رہے۔ اس کے ساتھ استاد کو بھی طالب علموں اور ان کے کام کا ایک رجسٹر رکھنا چاہئے۔ تاکہ کام چور طالب علم اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ زبانوں کی تعلیم کے متعلق میرے خیالات مجتہدانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن میرے ذاتی علم میں جو جو باتیں آئیں اُن کو استادوں کی دلچسپی کے لئے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور واقعہ

تو یہ ہے کہ ہر استاد اپنے لئے حالات کے مطابق خود راستہ بنا لیتا ہے لیکن دوسروں کے تجربوں سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو کم از کم انھیں سُن لینا کچھ زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا۔

"تحفۂ ادب" کی ترتیب کے متعلق یا اسے بہتر بنانے کے لئے جو صاحب خط و کتابت کرنا پسند فرمائیں ہیں ان کے مفید مشورے نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کرنے کو تیار رہوں۔

ڈون اسکول۔ ڈیرہ دون۔
۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء

محمد اشرف

میر امن دلی والے

میر امن خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے اِن کے آباواجداد سلاطین مغلیہ کے جاگیر دار رہے اور بڑے بڑے منصبوں پر سرفراز ہوئے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال پر جب دہلی کے گردونواح میں جاٹوں کا عمل دخل ہوا تو ان کی موروثی جاگیریں ضبط ہوئیں اور احمد شاہ دُرّانی کے حملہ میں گھر بار بھی لُٹ گیا۔ اُس وقت مجبوراً وطن چھوڑ کر پورب کا رُخ کیا۔ چند روز عظیم آباد میں رہ کر تلاشِ معاش میں کلکتہ پہنچے وہاں نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی میر کاظم خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ کے فورٹ ولیم میں ایک سرکاری کالج بنایا جس میں انگریز افسر دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس کالج کے پرنسپل جان گلکرسٹ صاحب مقرر ہوئے جنہیں اُردو کی ترقی کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اُردو زبان کی قواعد اور لغت تیار کی اور اپنی نگرانی میں بہت سی کتابیں لکھوائیں اسی کالج کے لئے میر امن نے چہار درویش نامی قصہ کا فارسی سے

سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

چہار درویش کے مصنف حضرت امیر خسرو ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ ایک مرتبہ بیمار ہوئے۔ اور بیماری کی حالت میں اپنے مرشد کا دل بہلانے کے لئے امیر خسرو نے یہ قصہ لکھا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر میر امّن نے اس قصہ کا ترجمہ باغ وبہار کے نام سے کیا۔ اس وقت دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم اردو نثر لکھنا عار سمجھتے تھے۔ کتابیں لکھنا تو درکنار خط وکتابت تک فارسی میں ہوتی تھی۔ اردو صرف بولنے یا شاعری کے کام آتی تھی۔ اردو زبان تاقیامت میر امّن کی ممنون رہے گی۔ کہ انہوں نے آج سے سواسو سال پہلے اردو نثر کی پرورش کرکے اس میں علمی زبان بننے کی صلاحیت پیدا کی۔

تمام کتاب کی زبان بہت سلیس وسادہ ہے اور مشکل لفظوں سے پاک ہے۔ گویا جو زبان اس عہد میں بولی جاتی تھی وہی لکھ دی ہے۔ اس سے اس زمانے کے شرفا کے روزمرہ بولنے چالنے کی زبان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سیر پہلے درویش کی

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے۔ اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ[۱] نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا یک بیک ایک ہی سال میں والدین تضائے الٰہی[۲] سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بار یتیم ہو گیا

---

[۱] باپ [۲] خدا کے حکم سے۔

کوئی سر پہ بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا
کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے چہلم[1] میں اپنے بیگانے
چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو
باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا۔ دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے
ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو
اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار
رہو۔ تسلّی دے کر وے[2] رخصت ہو گئے۔ گماشتے، کاروباری نوکر چاکر
جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھی نقد و جنس کو اپنی
نظر مبارک سے دیکھ لیجیے۔ ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ
پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش
فروش بچھا کر چھت، پردے چلونیں تکلّف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگار
دیدار[3] و نوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق پوشاکیں بنوادیں۔ فقیر مسند پر
تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانکڑے مفت پر کھانے پینے
والے۔ جھوٹے خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ اُن سے
آٹھ پہر صحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی اِدھر کی اُدھر
کی کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کیتکی[4] کی شراب پیجیے یا گلِ گلاب
کھنچوائیے اور عیش کیجیے۔

[1] مرنے کے چالیسویں دن کی رسم [2] پرانے زمانے میں وہ کی جگہ وے بولتے تھے اب متروک ہے
[3] خوبصورت [4] ایک مشہور خوشبودار پودے کا نام جو کیوڑے سے مشابہ ہوتا ہے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا۔ گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے اور کدھر جاتا ہے؟ مالِ مُفت دلِ بے رحم۔ اس تلذخرچی[1] کے آگے اگر گنجِ قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصہ میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی[2] کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے۔ کافور[3] ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چُرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار، ڈھلیت[4]، خاص بردار، ثابت خانی۔ سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسّر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا برقع مُنہ پہ ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا۔ بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے اُس کا

[1] فضول خرچی [2] بے حد دوستی [3] غائب [4] ڈھال باندھنے والے نوکر [5] محبت۔

بھی جواب اس خواب خرگوش[1] میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا
پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پاپیادہ
خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیر کے شہر میں جاکر
اس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماں جائی[2] میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے
مل کر بہت روئی۔ تیل، ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کئے۔ کہنے
لگی اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟
اسکا جواب میں کچھ نہ دے سکا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے
جلدی خاص پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک
مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو
شربت اور لوزیات[3]، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو۔ اور تیسرے پہر
میوے خشک تر، پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلئے
کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی سب طرح خاطرداری
کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع[4] کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار
شکر بجالایا کئی مہینے اس فراغت سے گزارے کہ پاؤں اس خلوت سے
باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی۔ اے
بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے
آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے

[1] غفلت کی نیند [2] بہن [3] بادام کی برفی [4] تکلیف۔

مجھے نہال کیا۔ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے
رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتیا[1] ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا
دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے
رہنے پر کہیں گے۔ اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں
پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے
نام کو لاج[2] لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں
اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے
تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو
یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی اور اس کی وہ نصیحت پسند کی۔ جواب دیا اچھا
اب تم ماں کی جگہ ہو۔ جو کہو سو کروں یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کر پچاس توڑے
اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور
بولی۔ ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس
تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر دیانتدار کے حوالہ کر کے دستاویز[3] پکی لکھوا لو
اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو۔ اپنا مال مع
منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری
کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع
کر لی۔ اور تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ
چلنے کی تیاری کی جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سرے پاؤ[4]

۱؎ گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ ۲؎ بےعزت ہونا ۳؎ رسید ۴؎ سر سے پاؤں تک کا قیمتی لباس۔

بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان کی ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے[1] سے لٹکا دیا۔ اور چھاگل[2] پانی کی شکار بند میں بندھوا دی امام ضامن[3] کا روپیہ میرے بازو پہ باندھا۔ دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی۔ سدھارو تمہیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا۔ تمہارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پہ بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا۔ بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں۔ اگر کواڑ کھول دو شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھڑک کر بولے۔ اسوقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟ جب میں نے جواب صاف ان سے سنا۔ شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اتر زین پوش بچھا کر بیٹھا۔

---

[1] گھوڑے پر باندھنے کا تھیلا۔ [2] بوتل۔ [3] بعض مسلمان گھرانوں میں دستور ہے کہ سفر کرتے وقت جانے والے کے دائیں بازو پر حسب توفیق روپیہ یا پیسہ کپڑے میں باندھ کر کہتے ہیں: "امام ضامن کے حوالے کیا" یعنی امام ضامن تمہاری حفاظت کریں گے۔ شیعوں کے آٹھویں امام علی رضا علیہ السلام کو امام ضامن بھی کہتے ہیں اور عقیدے کے مطابق یہ مسافروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ عام طور پر امام ضامن کا سکہ یا روپیہ لال کپڑے میں باندھا جاتا ہے۔

جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدمی رات اِدھر اور آدمی رات اُدھر ہوئی۔ سنسان ہوگیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھاکر خزانۂ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا۔ ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔

غالبؔ

اسد اللہ خاں نام۔ اور غالبؔ تخلص ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ شروع میں اردو غزلوں میں اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ لیکن اسی نام کا ایک اور شاعر بھی نواح دہلی میں موجود تھا۔ اِس لئے نازک طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ کسی اور کی تقلید کریں اور غالبؔ تخلص اختیار کرلیا۔

غالب کے بزرگوں کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دلّی آئے اور دربار شاہی میں ایک معزز عہدے پر سرفراز ہوئے۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ حیدرآباد میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم ہوئے پھر وہاں سے ترک ملازمت کرکے ریاستِ الور میں ملازمت اختیار کی اور یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اُس وقت مرزا کی عمر پانچ سال کی تھی۔ نصر اللہ بیگ مرزا کے حقیقی چچا اس وقت مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد میں صوبہ دار تھے۔ مرزا اُن کی سرپرستی میں پرورش پاتے رہے لیکن ابھی یہ نو سال کے ہی ہوئے تھے کہ چچا بھی مرگِ ناگہانی کا شکار ہوئے۔ بزرگوں نے لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑی تھی۔ مگر قسمت سے

کس کا زور چل سکتا ہے۔ بقول مولانا آزاد " وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا اُسے صرف ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے عزیبانہ زندگی بسر کرنی پڑی"۔ غدر کی مصیبت کے بعد رامپور سے سَو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا لیکن آخر وقت تک تنگدستی دم کے ساتھ رہی۔ ۷۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا اگرچہ ہندی تھے لیکن فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اور اسی پر ان کو ناز تھا۔ اُردو شاعری کو اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ مگر اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ زبان کے مسلّم الثبوت اُستاد ہوئے۔ معنی آفرینی۔ نازک خیالی۔ شکوہِ الفاظ۔ فارسی ترکیبوں کی جدت اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ نثر میں خط و کتابت کا وہ نرالا ڈھنگ نکالا کہ اس کے موجد کہلائے۔ اُن کے رقعات اُردو زبان کا بہترین سرمایہ ہیں۔ جو سلاست، ظرافت اور سادگی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

بنام میر مہدی مجروح

میاں تمہاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ اُنہوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں یہ کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے۔ جب وہ تیار ہو جائے گی میں اُن کو روپیہ دے کر لے لونگا۔ خاطر جمع رکھو پنشن سراسر سب کو شش ماہی ملنے کا حکم ہوگیا۔ ہر مہینے میں سو دہی لو اور کھاؤ کشمیری کٹرہ بگڑ گیا ہے۔ وہ اونچے اونچے در اور بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگذر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں مگر صرف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا گیہوں۔ چنا۔ باجرہ تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ نو سیر، ساڑھے نو سیر۔ اس خط کا جواب لکھو تو سب حالات مفصل لکھو۔

غالب۔ صبح چہارشنبہ۔ نہم جنوری ۱۸۶۱ء

(۲)

میر مہدی! تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اِس مہینے میں رامپور کیوں رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی

رمضان کے مہینے میں نمازِ عشاء کے بعد قرآن شریف سننے کی غرض سے مسلمان بیس رکعت نماز پڑھتے ہیں

میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آپہنچا۔ یک شنبہ کو غرۂ ماہِ مقدس[1] ہوا۔ اُسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سُنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم[2] مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں۔ اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سُنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں اُنہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیجدینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امرِ حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اِس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرطِ حیات جریدہ بعد برسات جاؤنگا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤنگا۔ قرار داد یہ ہے۔ کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینہ پاؤں اور دلی میں رہوں تو سو روپے۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اِس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ[3] و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے لڑکوں سے بھی میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیئے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار

---

[1] رمضان کے مبارک مہینے کا چاند۔ [2] روزہ کھولنے کا وقت۔ [3] گلے ملنا۔

روپے سال ٹھہری۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔ ایک صاحب نے نہ دیئے۔ مگر تین ہزار روپے سال۔ عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے۔ بنا رہا۔ خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں۔ القاب۔ خلعت سات پارچہ اور جیغہ[1] و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے بخشی۔ ناظر۔ حکیم کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کرلیں۔

(۳)

جویائے حالِ دہلی والور سلام لو۔ مسجد جامع واگذاشت[2] ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدرالدین۔ تفضل حسین خاں۔ تین یہ سات اور۔ اور ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن[3]۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گذارا ہے۔ بوتل

---

[1] پگڑی پر باندھنے کی کلغی۔ [2] چھوٹ گئی۔ واپس مل گئی۔ [3] جب کوئی مرتا ہے تو مسلمان کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کے پاس جائیں گے۔

گلاس موقوف۔ راجہ پٹیالہ مر گیا۔ مہندر سنگھ اس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے۔ ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے۔ وہ نواب گورنر جنرل کے آنے پر کھلے گا۔ اور وہ فروری میں یہاں آئیں گے۔ الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی اختیار دیں گے۔ یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اسی وقت پر ہوگا۔ بالفعل اپی صاحب ایجنٹ الور دلّی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجہ صاحب تجارہ تک ان کی مشایعت کو گئے۔ یہاں اپی صاحب سے کوئی صاحب سنگھ ٹھیکہ دار الور کی سڑک کا ہے۔ اُس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں پنچوں کو اختیار ہے۔ ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اور بولو کیا لکھوں۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علیخاں اور ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کر ہاتھ مُنہ دھوؤنگا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤنگا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤنگا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئیگا۔ کیا صحبت ہوگی۔ منگل کا دن ۲۳ ر جمادی الثانی ۱۶ ر دسمبر پہر دن چڑھے۔ غالب

(۴)

میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو۔ اِدھر آؤ۔ خبریں سنو۔ دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلّی کے علاقے کے جاگیر دار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو

لہ ساتھ جانا۔

پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر کو خبر کروائی جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند پنشن کے باب میں ہنوز لاؔ و نعمؔ[1] نہیں۔ مگر کچھ فکر کر رہا ہوں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام پیام نہیں ممکن۔ تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھئے کیا صورت درپیش آئیگی۔ مسلمانوں کی املاک[2] کے واگذاشت کا حکم عام ہو گیا ہے جن کو کرایہ پر ملی ہے۔ ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے۔ پہر دن چڑھا ہے کہ یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ جا ہو یہیں رہو جا ہو پھر چلے جاؤ۔ اپنی مرگ کا طالب غالب۔

(۵)

واہ واہ سیّد صاحب تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں مگر جاڑے نے بے حس کر دیا ہے۔ آج جو بسبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔ مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی[3] کروں۔ سنو اب تمہاری دلّی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت

---

[1] نہیں اور ہاں۔ [2] مکانات۔ جائداد۔ [3] لفظوں میں جادو کروں۔

خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں ہے۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل مرزا قیصر مرزا جواں بخت کے سالے۔ ولایت علی بیگ جے پور کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ دیکھئے کمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے ازروئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے۔ اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے اب شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔ میری جان سرفراز حسین[1] تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو۔ اب صورت کیا ہے۔ اور آئندہ عزیمت[2] کیا ہے۔ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔ میرن صاحب کہاں ہیں۔ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آئیے۔ السلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ کہئے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں۔ اگر بھیجا تو کیا لکھا۔ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں میں کہیں اور تم کہیں

---

[1] میر مہدی کے چھوٹے بھائی کا نام۔ [2] ارادہ۔

وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیونکر تم سے بے ادبیاں کر سکتے۔ انشاء اللہ تعالےٰ جب ایک جا ہونگے انتقام لیا جائیگا۔ ہے ہے کیونکر ایک جا ہونگے دیکھئے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ اللہ اللہ۔

(۶)

بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند[1] میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۱ دسمبر کو داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اُترتے ہیں۔ اور کیونکر دربار کرتے ہیں آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے۔ کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر۔ بہادر گڈھ۔ بلب گڈھ۔ فرخ نگر۔ دوجانہ۔ پاٹودی۔ لوہارو۔ چار معدوم محض[2] ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ۔ لوہارو تحتِ حکومت[3]۔ ہانسی۔ حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب چیف کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربارِ عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں۔ سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلّی ماروں میں سگِ دنیا موسوم اسدؔ۔ تینوں مردود مطرود محروم و مغموم ہے۔

---

[1] ملک ہندوستان [2] بالکل غائب۔ [3] سرکار انگریزی کے ماتحت۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے (سوء مزا ترا)

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی۔ خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھنا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا دیکھ جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ۔ چلے جاؤ۔

غالبؔ

(۷)

جانِ غالب تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔ اے میر مہدی[1] تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل موجود ہیں خس کی ٹٹی۔ پُروا ہوا اب کہاں نصیب۔ وہ تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگذرد۔ مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوں کا حال دیکھنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو

[1] میر مہدی نے اپنے خط میں دلّی والوں کی زبان کی تعریف کی تھی۔ مرزا اسکا جواب دیتے ہیں۔

ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغچہ کے اِس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہانتک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھُلے رہے ہیں۔ باقی سب اَٹ[1] گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رام جی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا۔ اُردو[2] بازار نہ رہا۔ اردو کہاں دلّی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں کمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

(۸)

سید صاحب نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔ تم مجبور میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفٰے خاں بمیعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی صرف

---

[1] بھر گیا۔ [2] کہتے ہیں کہ دلی میں جامع مسجد اور قلعہ کے درمیان ایک مشہور اردو بازار تھا جو غدر کے بعد تباہ کر دیا

رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیرآباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز حکم کچھ نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہوکر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد استماع[1] اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر ہفتہ کو گیا۔ منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے

[1] سننے ہی۔

حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنیل برون صاحب بہادر کی زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلّہ کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیجدی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھادو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنادو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اُس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہوجائے آپ شہر میں آباد ہوجائے آج تک یہ صورت ہے۔ یہانتک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہگیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تختوں پر آبیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ۔ اس کے سر پر ایک ٹوکرا اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا کہ ابا ہا ہا مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسید بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے فیضِ خاص ہیں لطفِ عام نہیں۔ شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بےخلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا۔ بادہ

انگوری سے بھرا ہوا انگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پنیسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے۔ پندرہ بگڑ گئے۔ بلکہ سڑ گئے۔ تا ان کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے ٹوکرے میں سے پھینک دیئے۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہے۔ مگر میں تمہاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمہارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خرید ے۔ خانہ آباد دولت زیادہ۔ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج[1] کئے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔

(۹)

میری جان خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہو نے آیا۔ داڑھی میں سفید بال آگئے۔ مگر بات سمجھنی نہ آئی پنشن کے باب میں اُلجھے ہوا اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلّی کے سب پنشن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنشن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعہ سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے ع

چیل لہو لائے گئی تو کاہے سے پٹکوں ناں

---

[1] نکالے جاتے ہیں۔

علی بخش خاں پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینہ کا پنشن دار بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں میں نے وہ سو روپے نہ لئے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنشن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں۔ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جاوے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجمٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلّی کے حمقا[1] جو باہر پڑے ہوئے ہیں۔ مُنہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ معاودت[2] کریں گے تب شاید آبادی ہو گی۔ یا کوئی اور نئی صورت نکل آوے۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔ برخوردار کامگار میر مہدی قطعہ

[1] احمق کی جمع۔ [2] واپس آئیں گے۔

تم نے دیکھا سچ مچ میرا حلیہ ہے بتاؤ اب کیا شاعری رہ گئی ہے جبو قت
میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے واسطے لکھا۔ ارادہ تھا کہ خط بھی
لکھوں لڑکوں نے سنایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے۔ ہمیں بھوک
لگی ہے تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیا
لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافہ میں رکھ کر ٹکٹ لگا کر سرنامہ لکھ کلیان کے
حوالے کر گھر میں چلا گیا

بنام نواب سید حسین مرزا صاحب

نواب صاحب! پرسوں صبح کو تمہارا خط پہنچا۔ پہر دن چڑھے
لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے قریب بھولو شاہ
کی قبر کے سامنے خیمہ خاصہ برپا ہوا۔ اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک
اترا ہے۔ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر ۱۸۵۹ء۔ آپ غالب کی مصیبت کی داستان
سنئے۔ پرسوں تمہارا خط پڑھ کر لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے
میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی
گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے
گھر آیا۔ کل پھر گیا خبر کروائی حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی
خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں

سلہ پتہ

تیرہ[1] و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نو میدی[2] جاوید ہے۔ نہ دربار۔ نہ خلعت نہ پنشن۔ بقیہ خبر شکر یہ ہے کہ راجہ بھرت پور برات لے کر پٹیالے گیا تھا۔ اور اس سبب سے آگرہ میں لارڈ صاحب سے نہیں ملا تھا۔ ایک ہفتہ سے معاودت[3] کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ آج شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء گیارہ بجے ہونگے میں خط لکھ رہا ہوں۔ توپیں چل رہی ہیں۔ شاید راجہ صاحب کی ملاقات اسی وقت ہوئی۔ کل یکشنبہ ہے۔ پرسوں دوشنبہ کو یا سہ شنبہ کو لارڈ صاحب کا کوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ پٹیالہ و رتک جائینگے کل صبح کو محمد قلی خاں آئے۔ ایک عرضی انگریزی اُن کے ہاتھ میں کہنے لگے یہ عرضی طالب علی فیل بان[4] نے مجھ کو پھیر دی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے گذرانتے کا موقع نہیں میں اسوقت سوار ہوا چاہتا تھا تمہاری پاس سُن کر گیا۔ اپنا۔ اپنا داغ حسرت جیسا اوپر لکھ آیا ہوں لیکن آیا کمشنر صاحب کا نائب یہاں کوئی نہیں اور نہ کسی انگریزی خواں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اتنا مسموع[5] ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ[6] نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ ایک سرکار سے ادا ہو گا۔ یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے۔ اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ بحل ہے اسکا معاوضہ نہ ہو گا شاید یہ وہی کمشنر ہوں۔ مکانات کو حامد علی خاں کا

---

[1] اندھیرا۔ [2] ہمیشہ کے لئے مایوسی [3] واپس آنا [4] مہاوت [5] سنا گیا ہے [6] معاف

کرکر[1] کیوں لکھتے ہو۔ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دوکانیں کرادی گئیں۔ سنگ و خشت[2] کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا عملہ بکا ہے سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ[3] ایک مکان ڈھا دیا جب بادشاہ[4] اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں! اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے نہ املاک رکھتے تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔

غالب۔ روز سہ شنبہ۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

بنام نواب یوسف میرزا صاحب

کوئی ہے! ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے۔ مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اب سن لو تفضل حسین خاں اپنے ماموں مؤید الدین خاں

---

۱ ملکیت ۲ پتھر اور اینٹ ۳ جس پر اپنی ملکیت اور قبضہ ہو ۴ حامد علی خاں جن کا مکان گرایا گیا تھا شاہ اودھ کے ہاں عہدہ دار تھے۔

کے پاس میرٹھ ہے۔ شاید دلی آیا ہو۔ مگر میرے پاس نہیں آیا۔ تم لکھتے ہو کہ پچاس محل[1] واجد علی شاہ کے کلکتے گئے۔ تمہارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہِ اودھ بنارس آ گئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات[2] نہیں ہے۔ اُدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں۔ اِدھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو۔ مگر میری جان ہم کو کیا۔

یوسف میرزا میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوّت متفکرہ[3] میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اسکا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے۔ غم فراق۔ غم مرگ غم رزق۔ غم عزّت حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اُس کی بیٹی اسکے چار بچے۔ اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج[4] و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں بس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے۔ اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں، ایک بیوی، دو بچّے، تین چار آدمی گھر کے کلّو۔ کلیان۔ ایاز۔ باہر مداری کے جورو بچّے بدستور۔ گویا مداری بھی موجود

[1] ملکہ کے علاوہ بادشاہ کی بیویاں محل کہلاتی تھیں۔ [2] ایک دوسرے کے خلاف ہونا۔ [3] سوچنے کی قوت [4] بیوی بچے۔

ہے۔ میاں گھمّن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھّا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسہ کی آمد نہیں ہیں آدمی روٹی کھانے والے موجود ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں۔ بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا ضعفِ[1] قویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں۔ ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ[2] فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا۔ نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق[3] جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسّر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا۔ خلعتِ فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں۔ نہ بے گناہ ہوں نہ گناہگار ہوں۔ نہ مخبر نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو۔ اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔ دو مہینے رات دن خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دے دیا وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دیگا۔

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

کیوں صاحب مجھ سے کیوں خفا ہو۔ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائیگا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا

---

[1] کمزور اعضاء۔ [2] بیمار۔ [3] شراب۔

کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں شیوجی رام برہمن۔ اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں جو گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں وہ آمد خطوط کی موقوف، صرف تین صاحبوں کے آنے کی توقع اُس ہیں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو سُنو صاحب۔ اپنے پر لازم کر لو۔ ہر مہینے ایک خط مجھ کو لکھنا اگر کچھ کام آپڑا تو دُو خط تین خط ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیجدی۔ بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا اسکا جواب بھیجدیا گیا۔

مولوی قمر الدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں کیسواسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤنگا۔ بہرحال اگر آپ آزردہ نہیں تو جس دن میرا خط پہنچے اُس کے دوسرے دن اسکا جواب لکھئے۔ اپنی خیر و عافیت منشی صاحب کی خیر و عافیت۔ مولوی صاحب کا احوال۔ اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظ مناسب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے اس کی حقیقت دھولپور کا رنگ۔ صاحبان عالی شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے۔ وہاں کے رہنے والے

کچھ خائف ہیں یا نہیں۔

غالب نگاشتہ شنبہ۔ ۱۹ر جون ۱۸۵۸ء

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالب۔ سوموار۔ ۷ر دسمبر ۱۸۵۸ء

نذیر احمد

مولوی نذیر احمد صاحب کا اصلی وطن ضلع بجنور ہے جہاں ۱۸۳۶ء
میں پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں تحصیل علم نے دہلی پہنچا دیا اور پھر یہیں پر
مستقل سکونت اختیار کر لی۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھنے
کے بعد ۱۸۴۵ء میں قدیم دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج میں تکمیل
تعلیم کے بعد پنجاب میں مدرسی کی۔ پھر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس
ہو گئے۔ بقدر ضرورت انگریزی زبان بھی سیکھی اور گورنمنٹ کے ایما
سے تعزیرات ہند کا انگریزی سے با محاورہ اردو زبان میں ترجمہ کیا
جس کے صلہ میں تحصیلداری ملی اور رفتہ رفتہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔
۱۸۷۷ء میں سر سالار جنگ کی وساطت سے حیدر آباد
دکن میں محکمۂ مالیات کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے اور وہاں سے عزت و
احترام کے ساتھ پنشن لے کر دہلی تشریف لائے۔ آخر ۱۹۱۲ء میں
انتقال فرمایا۔

مولوی نذیر احمد صاحب نے سر سید احمد خاں کی علمی امداد کے

علاوہ خود بھی مسلمانوں کے لئے بہت سے رفاہِ عام کے کام سرانجام دیئے ہیں۔ جس میں تعلیمِ نسواں کی تحریک نہایت نمایاں ہے۔

مولوی نذیر احمد کی زبان دہلی کی ٹکسالی اُردو ہے۔ اور تحریر کی روانی اور دلچسپی خاص درجہ امتیاز رکھتی ہے۔ آخر وقت تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اکثر کتابیں تعلیمِ نسواں کی ترویج کے متعلق افسانوں کے پیرایہ میں لکھی ہیں۔ جو آج کل گھر گھر مشہور ہیں۔ ان کی تقریریں خاصکر مذہبی جلسوں میں جوش اور خلوص سے بھرپور ہوتی تھیں۔ جن کی زبان کا چٹخارہ اور ظرافت کی چاشنی سامعین کو مسحور کر دیتی تھی۔ گویا تقریر اور تحریر دونوں کے بادشاہ تھے۔

مولوی نذیر احمد صحیح معنوں میں اُردو زبان کے پہلے ناول نگار ہیں۔ جنہوں نے افسانوں کے پیرائے میں قوم و ملت کی اصلاح کی۔ چنانچہ ان کا ہر ناول سبق آموز اور ایک خاص مطلب کی ترجمانی کرتا ہے۔

علمی اور سرکاری خدمات کے صلہ میں سرکار انگریزی سے آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ اور پنجاب یونیورسٹی نے اعزازی طور پر ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی۔ اس کے علاوہ انگلستان کی ایک یونیورسٹی نے بھی قانونی ڈگری پیش کی۔ ان کی اکثر کتابیں گورنمنٹ نے بہت پسند کیں جن پر گراں بہا انعامات ملے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی تصانیف میں مراۃ العروس۔ بنات النعش
توبۃ النصوح۔ ابن الوقت۔ محصنات اور رویائے صادقہ خاص طور
پر مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کا فصیح اور بامحاورہ ترجمہ بھی کیا
ہے۔ جو اپنی قسم کا پہلا ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

اتنی مدّت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں۔ یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر بہ مجبوری، دفع ضرورت کے لئے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عملوں[1] اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں چغلی کھانے کا موقع ملے مجھ کو بعض ایسے کریم النفس[2] انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنہوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگذاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں۔ اور میں اُن کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنہوں نے مجھ پر احسان کئے ہیں اُن کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی

[1] ماتحتوں۔ [2] دل کے سخی۔

کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں۔ تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی، وہی بے عزتی، جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو، کلکٹر، جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں[1] ہیں۔ اگر یورپشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی آنت[2] کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹری کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پونگی[3] نہیں تو دُلکی ہی سہی کا لبتہ لے کر بھاگ سکے پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ[4] کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکوتھیاں[5] کرا دی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے

[1] دربار [2] بہت لمبے [3] بے وقوف اور پیسے والا۔ [4] رشوت کھلانا۔

دم لیا۔ اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے مُنہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوارا۔ آہستہ سے عمامے[1] کو ذرا اور جما لیا۔ چُغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کیئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔ خدمتگار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطہ کے باہر ہی تاڑ لیا تھا کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً[2] اِدھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی، اور چیزوں کے رکھنے کی، اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں، مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بُلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں۔ کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہو گا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے کے اندر گھس گیا۔ اِدھر کو رُخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کیئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چِٹھی لیئے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں

[1] پگڑی۔ [2] جان بوجھ کر۔

اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق[1]، آپ مُنہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا[2] "کیوں جمعدار! کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے"؟ بس اِس کو ڈپٹی کلکٹر کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں۔ صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آپڑے چار و ناچار اُٹھتا ہوا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اُڑا تا ہے۔ اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو لیکن آپ بیٹھئے ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا۔ اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں اپنے سر پر۔ تب اُسنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد۔ گویا بید کی تپائی لاکر ڈال دی۔ اِس کے بعد سے جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے (الہٰی۔ کیا غسلِ میّت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہانتک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں یہ سُن کر جی ہی تو بیٹھ گیا۔ کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں، آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کیا بھروسہ۔ اتنی محنت کیوں ضائع کی جائے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر آیا کہ سررشتہ دار کو

---

[1] عزت کی پرواہ نہ کی۔ [2] بے غیرت بن کر خود پوچھا۔

رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے ۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب تو اپنا سا مُنہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا ۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا۔ میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہو گئے تو آپ میرے آدھ سیر آلے کا فکر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ مُنہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں۔ معلوم ہے۔ شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو۔ مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی۔ خیر آخر آپ ہی سر اُٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب حاکم بالادست[1] ہو کر جو اتنی آؤ بھگت[2] کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے

---

[1] افسر [2] خاطر تواضع

کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر[1] الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا، مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہو قسم لو۔ تم خدا کے بندے ہو۔ یقین ماننا۔ بس ڈنڈے پر الگ تھلک جیسے اڈّے پر گلدم۔ کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کے کہا "خداوند سررشتہ دار حاضر ہیں"۔ صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرماتے ہیں "اچّا آنے بولو" یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔ سبحان اللہ سات برس اسسٹنٹ رہے۔ نو برس کے قریب جنٹ اور سولھا برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لئے فرلو[2] پر ولایت گئے۔ بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ جھونکا[3]۔ چودہ برس میں حضرت نے اُردو میں کمال حاصل کیا ہے "اچّا آنے بولو"۔

اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں اور سررشتہ دار مردود، آگے آگے آپ، پیچھے بستہ قلمدان لئے ہوئے چپراسی، آ ہی گھسا۔ سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں "ول صاحب گرمی بوٹ"۔

میں (گردن جھکا کر) ہاں خداوند! گرمی کے تو دن ہی ہیں

---

[1] پرانے زمانے میں ایک عہدے کا نام تھا۔ [2] چھٹی۔ [3] یہ مثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے کہ جو شخص باوجود سالہا سال کسی کام میں لگے رہنے کے بھی کورے کا کورا رہے۔

میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لُو سے
بھی کئی آدمی مرے۔ صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل
میں کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا۔ ارے ظالم تجھ کو یہ
یہ بھی خدا کا ترس نہ آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے
ایک ٹٹی ملی ہے (ناظر[1] اپنی بدذاتی سے تین برس کے پڑا رہنے
خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر
بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر میں
ٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا اکھن رہا ہے۔ لاؤ
سلام لے کر اُس کو آزاد کروں۔ میں سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لُو سے مرنا
سُن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی
کتنے آدمی مرے۔ کب مرے۔ لُو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں
اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں۔ غرض آدمی کا
دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو
کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں۔ یا کالے
آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی۔ اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ
کھول کر کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات
ہو رہی ہے کہ دونوں چُپ۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا چکا۔ لگا صاحب
کا مُنہ دیکھنے۔ تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں "آپ کچُھ کچُھ" یعنی آپ کو

[1] کچہری کا ہیڈ کلرک۔

کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں۔ میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا۔ پھر حاضر ہونگا۔" میری اِس آخری بات میں، اور ایسی باتیں ہی کونسی بہت ہوئی تھیں کہ اس کو آخیر کہوں، بلکہ دوسری بات میں کہ جی ملنے کو چاہتا تھا۔ بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا۔ اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔

ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور راٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت، سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف ماتھا[1] پھوڑ ول، وہ بھی اپنے سر کا چھدا[2] اتار لے کے لئے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا اُلٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح[3] اُن لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمتگاروں کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کیا ہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا

---

[1] سر ٹکرانا۔ [2] فرض۔ بوجھ۔ [3] بے عزتی۔

سو کھا گیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہ پڑی۔ اب یہ حشرات الارض[1]
کہاں سے نکل پڑے۔ آہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک
سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ یہ سرکاری پیادے اُس کا جرمانہ وصول
کرنے کے لئے مجھ پر تعینات ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں مکان، مکان پر
تنخواہ پر دیکھا جائیگا۔ عید قریب ہے۔ اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں
چھوڑتے۔ آخر میں نے ترش رو[2] ہو کر کہا کہ اِس وقت میرے پاس نہیں
ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی ہی بے اعتباری
ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر
ایک آدمی تیار سا ہوا۔ کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے۔ اتنے
میں جمعدار نے پنسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور
ناظر کو رقعہ لکھدیں۔ جب جب میں قلم اٹھاتا۔ بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے
تھے۔ "پہلے فرما دیجئے کہ آپ کیا لکھتے ہیں"

اِسی کشمکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا۔ سائیس
پٹ کھولے کھڑا ہی تھا۔ لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ غڑپ بگھی کے
اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا۔ اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے
ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پُرزے میں ایک
روپیہ رکھ۔ پُڑیا بنا، اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی
سے مُنہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پُڑیا اٹھائی بھی، ایک روپیہ

[1] زمین کے کیڑے۔ [2] خفا ہو کر۔

دیکھ کر یقیناً بہت ہی بگڑے ہونگے۔ مگر میں اُن کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی اُدھیڑ بُن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹینگے ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امرِ اضافی[1] ہے۔ مجھے اپنے اقران و امثال[2] پر نظر کرنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی مدارات کی جاتی ہے۔ تو جس مجلس میں یہ سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔

اسی حیص[3] و بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظرِ ملاقات بیٹھے ہوئے تھے مگر نہ وہ ڈپٹی صاحب تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاجِ اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیئے جوں مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے "اللہ اکبر۔ ڈپٹی صاحب آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی[4]۔ کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوا ہوں"۔

دوسرے صاحب "آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔

---

[1] اس کا تعلق ہر آدمی سے الگ الگ ہے یعنی ایک بات جو ایک آدمی کے لئے عزت کا باعث ہے وہی چیز دوسرے آدمی کے لئے بے عزتی ہو سکتی ہے۔ [2] برابر والوں [3] تکرار۔ لڑائی [4] گھل مل کر

میں نے کہا بس آج کسی کی دال نہیں گلتی[1]۔

تیسرے صاحب۔ "مدّت سے جدید تحصیلداری قایم ہونے کی خبر تھی۔ یہانتک کہ بورڈ سے منظوری بھی آچکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اِسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی"

لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے خدا کرے لوگ ایسی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

(از ابن الوقت)

نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

نصوح نے نمازِ عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پچھوایا کہ دیکھو مدرسے سے آئے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابھی آئے ہیں اور کپڑے اتار رہے ہیں۔ تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا کی ذرا میرے پاس ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں علیم مدرسے کا لباس اُتار کتابیں ٹھکانے سے رکھ۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی باپ نے کہا۔ آؤ صاحب۔ آج کل تو میں نے سُنا ہے تم کو بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے؟

بیٹا۔ امتحان ششماہی قریب ہے۔ اُسی کے واسطے کچھ تیاری

[1] کام نہیں بنتا۔

کر رہا ہوں۔ دن تھوڑے سے رہ گئے اور کتابیں دیکھنے کو بہت باقی ہیں۔ ہر چند ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو گھر پر کتاب دیکھا کروں، مگر نہیں بن پڑتا۔ لوگ جو بھائی جان کے پاس آکر بیٹھتے ہیں ایسی اُودھم مچاتے ہیں کہ طبیعت اچاٹ ہوئی چلی جاتی ہے۔

باپ۔ پھر تم کچھ اس کا انسداد نہیں کرتے؟

بیٹا۔ اس کا انسداد میرے اختیار سے خارج ہے۔ اور رات رائیگاں جاتی ہے۔ دن کو البتہ میں نے مکان کا رہنا چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی اور اپنے کسی ہم جماعت کے یہاں چلا گیا۔

باپ۔ اور بڑے امتحان کے واسطے بھی تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا۔ ابھی اس کے بہت دن پڑے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر دیکھا جائیگا۔

باپ۔ کیا اُس کا کوئی وقت مقرر ہے؟

بیٹا۔ جناب ہاں بڑے دن کی تعطیل کے قریب ہوا کرتا ہے۔

باپ۔ نہیں نہیں۔ تم نے میری مراد کو نہیں سمجھا۔ میں حسابِ آخرت کو بڑا امتحان کہتا ہوں۔ کیا وہ بڑا امتحان نہیں ہے؟

علیم باپ کا مُنہ دیکھنے لگا۔ تو پھر باپ نے کہا۔ کیا تم حسابِ آخرت کو بڑا امتحان نہیں سمجھتے۔ یا تم کو اس میں کچھ کلام ہے۔

علیم۔ کیوں نہیں سچ پوچھئے تو سب سے بڑا سخت امتحان وہی ہے،

باپ۔ تو جب میں تمہارے اِن دنیاوی چھوٹے چھوٹے امتحانوں کی خبر رکھتا ہوں تو کیا اُس بڑے سخت امتحان کی نسبت میں نے تم سے پوچھا تو کیا بے جا کیا؟

بیٹا۔ جناب میں تو نہیں کہتا کہ آپ نے بیجا کیا۔ ایسا کہنا میرے نزدیک گستاخی اور گناہ دونوں ہیں۔

باپ۔ اچھا تو میں سُننا چاہتا ہوں کہ تم اس بڑے سخت امتحان کے واسطے کیا تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا۔ جناب سچ تو یہ ہے کہ میں نے اُس امتحان کے واسطے مطلق[1] تیاری نہیں کی۔

باپ۔ کیا یہ غفلت نہیں ہے؟

بیٹا۔ جناب غفلت بھی پرلے درجہ کی غفلت ہے۔

باپ۔ بیٹا! لیکن جب تم ایسے دانشمند ہو کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لئے مہینوں اور برسوں پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اس سخت امتحان سے غافل رہنا بڑے تعجب کی بات ہے۔

بیٹا۔ شامت نفس[2]۔

باپ۔ لیکن تمہاری غفلت کا کچھ اور بھی سبب ضرور ہو گا؟

بیٹا۔ سبب یہی ہے۔ میری سہل انگاری[3]۔

باپ۔ تم جواب دیتے ہو۔ لیکن صرف لفظوں کو پھیر پھار کر۔

---

[1] بالکل۔ [2] عقل کی بدبختی۔ [3] کاہلی - بے پرواہی۔

میں تم سے غفلت کا سبب پوچھتا ہوں اور تم نے کہا سہل انگاری اور سہل انگاری اور غفلت ایک چیز ہے۔ تو گویا تم نے غفلت کو غفلت کا سبب کہا۔

بیٹا۔ شاید گھر میں دینداری کا چرچہ نہ ہونے سے میری غفلت کو ترقی ہوئی ہو۔

باپ۔ بے شک یہی سبب ہے تمہاری غفلت کا۔ اور میں نے تم سے کھود کھود کر اس لئے دریافت کیا کہ تمہاری غفلت میری بے پرواہی کی وجہ سے ہے۔ اس کا الزام مجھ پر ہے۔ اور ضرور ہے کہ میں تمہارے روبرو اس کا اقرار کروں اور تم چھوٹے ہو کر مجھ کو ملامت کرو۔

بیٹا۔ نہیں جناب قصور سراسر میرا ہے۔ مجھ کو خدا نے اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی عقل تو دی تھی کہ مجھ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ اور میرے پیدا کرنے سے صرف یہی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں جانوروں کی طرح کھانے اور پانی سے اپنا پیٹ بھر کر سورہا کروں۔

باپ۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری دینی معلومات بھی کم درجہ کی نہیں ہے۔ لیکن نہ تو دین کے مسائل میں نے تم کو خود سکھائے نہ اُن کے سیکھنے کی کبھی تاکید کی۔ مدرسے میں تاریخ جغرافیہ وہندسہ وریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں پھر تم نے دینی معلومات حاصل کی تو کہاں سے کی؟

بیٹا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا لیکن وہ دوسرے ملک کی زبان میں ہے۔ طوطے کی طرح اوّل سے

آخر تک پڑھ گیا مطلق سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ اور کیا اسکا مطلب ہے۔ پھر مکتب میں گیا تو وہاں بھی کوئی دین کی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ قصّے کہانی ان میں بھی اکثر بُری بُری باتیں۔ یہانتک کہ جن دنوں میں بہار دانش پڑھتا تھا ایک پادری صاحب چاندنی چوک میں سرِ بازار وعظ کہا کرتے تھے۔ مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا بھی ایک بڑا بھاری ذخیرہ رہتا تھا۔ اور اکثر لوگوں کو اس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے اُنہوں نے کتاب کی جلد تو اُکھاڑ لی اور ورقوں کو یا تو پھاڑ کر پھینک دیا یا پٹھے بنائے۔ کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھ کو بھی لالچ آیا اور میں نے کہا چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتاب مانگیں۔ مکتب سے اُٹھ میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا۔ بہت سے لوگ اُن کو گھیرے ہوئے تھے۔ اُن میں ہمارے مکتب کے بھی دو چار لڑکے تھے۔ لوگ اُن کے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے۔ اُس کو میں نے خوب نہیں سمجھا۔ مگر ایک بات تھی کہ اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو مسلمان سینکڑوں آدمی ایک طرف، لوگ اُن کو سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا۔ مگر پادری صاحب کی پیشانی پر چین[1] بھی تو نہیں آتی تھی۔ سخت بات سُن کر اُلٹے مُسکرا دیتے تھے لڑکے ایک شیطان ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کھڑے سُنتے رہے۔

---

[1] بل۔

چلنے لگے تو اُن میں سے ایک نے کہا۔ لُو لُو[1] ہے بے لُو لُو۔ اس کی یہ بات سب لوگوں کو ناگوار ہوئی اور دو چار آدمیوں نے اس کو مارنے کے لئے تھپّڑ بھی اٹھائے۔ پادری صاحب نے روکا اور منع کیا کہ خبردار اس سے کچھ مت بولو۔ لُو لُو موتی کو بھی کہتے ہیں۔ شاید اُس نے یہ سمجھ کر کہا ہو تو اسکو انعام دینا چاہیئے۔ پادری صاحب کی اس بات نے مجھ پر کیا شاید سب لوگوں کے دل پر بڑا ہی اثر کیا۔ اور جب شام ہوئی لوگ رخصت ہوئے تو کئی آدمی آپس میں کہتے جاتے تھے کہ بھائی اس شخص کا عقیدہ[2] چاہے کیسا ہی ہو۔ لیکن حلم[3] اور بُردباری یہ صفت تو اس میں اولیا اللہ کی سی ہے۔ غرض پادری صاحب تو وعظ میں مصروف تھے اور میں اپنی تاک میں تھا کہ ذرا بھیڑ کم ہو یا پادری صاحب کا سلسلۂ سخن منقطع ہو تو کتاب مانگوں لیکن نہیں معلوم پادری صاحب کو میرے قیافے[4] سے یا کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں کچھ اُن سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی پوچھا کہ صاحبزادے تم کچھ مجھ سے کہو گے؟ میں نے کہا کہ آپ سب لوگوں کو کتابیں دیتے ہیں ایک کتاب مجھ کو بھی دے دیجئے۔

پادری صاحب۔ بہت خوب اس الماری میں سے تم ایک کتاب پسند کر لو۔

میں نے سُنہری جلد کی ایک بڑی موٹی سی کتاب چھانٹی تو پادری صاحب نے کہا کہ مجھ کو اس کے دینے میں تو کچھ عذر نہیں لیکن تم اس کو

---

[1] پاگل [2] مذہب [3] مزاج کی نرمی [4] شکل۔

پڑھ بھی سکو گے؟ کونسی کتاب تم پڑھتے ہو؟

میں نے کہا۔ بہار دانش۔

پادری صاحب ۔ بھلا تمہارا آج کا سبق ہیں بھی سُنوں میں نے جُز دان میں سے کتاب نکال پڑھنا شروع کیا۔ اُس دن کا سبق کمبخت ایسا فحش اور بیہودہ تھا کہ لوگوں کے مجمع میں مجھ کو اسکا پڑھنا دشوار تھا۔ بمشکل کوئی دو تین سطریں میں نے پڑھی ہوں گی۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ بے شک تم نے جو کتاب پسند کی ہے اسکو بخوبی پڑھ سکو گے۔ اور وہ کتاب میں تم کو خوشی سے دیتا ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں کہ کیوں میں نے تم کو ایسی کتاب کے پڑھنے کو کہا جس کے پڑھنے سے تم اور سُننے سے میں اور یہ سب صاحب جو کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کے گنہگار ہوئے۔ خدا ہم سب کی خطا کو معاف کرے۔ اور تم چاہے میری دُوسری بات مانو یا نہ مانو لیکن اس کتاب کو ضرور چھوڑ دو۔ کہ اس کا مطلب تمہارے مذہب کے بھی بالکل خلاف ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ یہ کتاب جو تم پڑھتے ہو تم کو گناہ اور بُرائی سکھاتی اور بداخلاقی اور بے حیائی کی خراب راہ دکھاتی ہے۔ باوجودیکہ لوگ پادری صاحب کی ہر ہر بات کو کاٹتے تھے مگر اس کو سب نے تسلیم کیا۔

پادری صاحب سے جو کتاب میں مانگ کر لایا اس کا نام تو مجھ کو معلوم نہیں، مگر سلیس اُردو میں کسی خدا پرست اور پارسا آدمی کے حالات تھے اگرچہ فی الواقع میں اس کتاب کو جلد ہی کے لالچ سے لایا تھا لیکن میں نے

کہا لاؤ دیکھوں تو اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں میں اس کو پڑھتا جاتا تھا۔ میرا دل اس میں لگتا تھا اور اس کی باتیں مجھ کو بھلی معلوم ہوتی جاتی تھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز[1] زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوقات ہوں۔ اکثر اوقات مجھ کو اپنی حالت پر رونا آتا تھا اور گھر والوں کا وطیرہ دیکھ دیکھ کر مجھ کو ایک وحشت ہوتی تھی۔ یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ مصیبت مند لوگوں کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ یا اس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف سمجھنے لگا۔ مکتب اور بہار دانش دونوں کو تو میں نے اُسی دن سلام[2] کیا تھا۔ جس روز کہ پادری صاحب نے مجھ کو نصیحت کی۔ گھر میں اکیلا پڑا ہوا دن بھر اُسی کتاب کو دیکھا کرتا۔ مکتب کے لڑکے چند بار مجھ کو بلانے آئے۔ مگر میں نہ گیا۔ آخر خود میاں جی صاحب تشریف لائے اور میں نے جی مضبوط کر کے اُن سے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو پڑھنا منظور نہیں۔ آپ ان دنوں دکن میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز نصیبوں کی شامت میں نہیں معلوم کہاں چلا گیا۔ میری غیبت[3] میں وہ کتاب کہیں بھائی جان کی نظر پڑ گئی۔ شب برات کے کوئی چار پانچ دن باقی تھے۔ بھائی جان کو پٹاخوں کے واسطے ردی درکار تھی۔ بے تامل کتاب کو چیر پھاڑ برابر کر دیا میں نے آکر دیکھا۔ بہتیرا سر پٹکا۔ کیا ہوتا تھا۔ دوڑا ہوا چوک گیا کہ پادری صاحب ہوں تو دوسرا نسخہ[4] لاؤں مگر معلوم ہوا کہ صاحب آگرے چلے گئے ہیں کیف

---

[1] طریقہ [2] چھوڑ دیا [3] غیر حاضری [4] کتاب۔

افسوس مل کر رہ گیا۔

بھائی صاحب کے دوستوں سے شکایت کی تو انھوں نے کہا میاں شکر کرو کہ وہ کتاب پھٹ گئی نہیں تو تم کرسٹان[1] ہی ہو گئے ہوتے یہ جواب سُن کر تو مجھ کو ایک نئی حیرت پیدا ہوئی۔ کہ اگر کرسٹان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کا حال میں نے اس کتاب میں پڑھا تو ان کو بُرا سمجھنا کیا معنی؟ خیر چندے یہ خیالات رہے اُس کے بعد تو میں مدرسے میں داخل ہوا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر آپ کے نزدیک میرے خیالات دین و مذہب سے کچھ علاقہ[2] رکھتے ہیں تو یہ صرف اُس کتاب کا اثر ہے ورنہ دین کا کوئی رسالہ بھی مجھ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

باپ۔ اہلِ اسلام اور عیسائیوں کے معتقدات[3] میں کچھ اختلاف ہے۔ مگر پھر بھی جسقدر کہ عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہوا ہے اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں ملتا۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور اُن کے بزرگانِ دین قسیسوں[4] اور راہبوں[5] کی تعریف آئی ہے۔ عیسائیوں کی نرم دلی اور خاکساری کی مدح کی ہے۔ ان کی انجیل کلام الٰہی ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ مواکلت[6] درست۔ مناکحت[7] روا۔ غرض اسقدر معاشرت[8] کہ اہلِ اسلام عیسائیوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ میں اس کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ یہ اس ملک کے ہندوؤں کے اختلاط کا اثر ہے۔ افسوس ہے ہم مسلمانوں کے

---

[1] عیسائی [2] تعلق۔ [3] مذہبی باتیں۔ [4] پادریوں۔ [5] وہ پادری جو دنیا ترک کر دیتے ہیں۔ [6] کھانا پینا [7] شادی جائز ہے۔ [8] غیریت۔

کہ ایسا عمدہ اور پاکیزہ اور مکمل اور بدیہی مذہب رکھ کر مطلقاً اس کی قدر نہیں کرتے۔ پادریوں کا سا اہتمام تو کہاں نصیب ہوتا تھا۔ اتنی بھی توفیق نہیں کہ اپنی اولاد کے دین و مذہب کی تو خبر رکھیں۔ اولاد تو اولاد سرے سے اپنے ہی مذہب کا ٹھکانا نہیں۔ نام کے مسلمان اور عمل دیکھو تو بدتر از شیطان۔ میں کسی دوسرے کو کیا الزام دوں کہ میں آپ سب سے بدتر نکمتر ہوں۔ کیا یہ کچھ تھوڑی بات ہے کہ تمہاری اتنی عمر ہونے آئی اور بہیترا ہی کچھ لکھا پڑھا بھی مگر دین کی ایک ہی کتاب تمہاری نظر سے گذری، وہ بھی عیسائیوں کی اور اتفاقیہ طور پر۔ خیر بہرکیف اسوقت جو ضرورت مجھ کو درپیش ہے یقین ہے کہ تمہارا اس کتاب کو دیکھ لینا بھی اُس میں بہت کام آئیگا۔ ہمدردی کی جیسی کچھ تاکید ہے تم نے اس کتاب میں دیکھا ہوگا۔

بیٹا۔ اگر وہ مذہبی کتاب تھی تو میں جانتا ہوں کہ خاکساری و ہمدردی شرطِ عیسائیت ہے

باپ۔ شرطِ عیسائیت کیسی؟ بلکہ شرطِ انسانیت ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

لیکن میں تم سے سُننا چاہتا ہوں کہ تم اِس فرض کی تعمیل کہانتک کرتے ہو

بیٹا۔ جناب شاید اگر میں اس کو ہمدردی کہہ سکوں تو مدرسے کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا ہے اُس میں مطلق دریغ نہیں کرتا۔ گو میرا ذاتی ہرج بھی ہوتا ہو۔ امتحانِ سالانہ میں مجھ کو نقد روپے ملے تھے میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ محلّے میں چند آدمی

رہتے ہیں۔ جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً اُن کو اِس میں سے دیتا رہا بلکہ ایک مرتبہ میں ایک دِقّت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

باپ ۔ وہ کیا؟

بیٹا۔ ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو امّاں جان نے بنا دی تھی، وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے خالہ جان کے یہاں جاتا تھا۔ میاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپراسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی جمع تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت غریب بوڑھی عورت ہے چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں۔ سرکاری پیادے اُس کے میاں کو پکڑے لئے جا رہے ہیں۔ اِس واسطے کہ اُس نے کسی بنیئے کے یہاں سے اُدھار کھایا تھا۔ اور بنیئے نے اُس پر ڈگری جاری کرائی تھی۔ وہ مرد کہتا تھا۔ قرضہ واجب ہے مگر میں کیا کروں اِس وقت بالکل تہی دست[1] ہوں۔ ہر چند اُس بیچارے نے بنیئے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری خوشامد کی مگر نہ بنیا مانتا تھا نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لئے چلے جاتے تھے لوگ جو وہاں کھڑے تھے اُنہوں نے بھی کہا۔ لالہ۔ جہاں تم نے اِتنے دنوں صبر کیا دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ۔ تو بنیا بولا۔ اچھی کہی۔ میاں جی اچھی کہی۔ برسوں کا ناواں[2] اور روز[3] کی ٹال مٹول۔ بھگوان جانے ابھی تو کھماں جنے کی اجت[4] اُتروائے لیتا ہوں۔ وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی غریب تو تھا۔

---

[1] خالی ہاتھ یعنی غریب [2] روپیہ [3] روز [4] عزت۔

لیکن غیرتمند بھی تھا۔ بنیئے نے جو عزت اُتروانے کا نام لیا۔ سُرخ ہوگیا اور گھر میں گھُس کر تلوار میان سے نکال چاہتا تھا کہ بنیئے کا سر الگ کر دے کہ اُسکی بیوی اُس کے پیروں میں لپٹ گئی۔ اور رو کر کہنے لگی۔ خدا کے لئے کیا غضب کرتے ہو۔ یہی تمہارا غصہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف کرو کیونکہ تمہارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ ماں کو روتا دیکھ بچّے اِس طرح ڈاڑھیں مار مار کر روئے کہ میرا تو دل ہل گیا اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گئے

اُن کی یہ حالت دیکھ کر خانصاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان میں کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور بی بی سے کہا اچھا تو نیک بخت۔ پھر مجھ کو اِس بے عزتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔

بی بی نے کہا بلا سے جو چیز گھر میں ہے اُس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ[1] چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہجاؤ تو پھر جیسی ہو گی دیکھی جائے گی۔ تو آچکی۔ پانی پینے کا کٹورا۔ نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں۔ بس یہی اُس گھر کی کُل کائنات[2] تھی۔ چاندی کی دو دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار۔ اُس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب سامان خانصاحب نے باہر لاکر اُس بنیئے کے رُوبرُو رکھدیا۔ اوّل تو بنیا اُن چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ یہانتک کہ اُن سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ اُنہوں نے بھی بنیئے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اِس بات پر رضامند ہوا کہ پانچ روپے اصل اور دو روپے سود ساتوں کے

---

[1] پیچھا [2] مالیت

ساتوں دے دیں تو فارغ[1] خطی لکھدے لیکن خانصاحب کا کُل اثاثہ[2] چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپئے کی کسر رہ گئی ہے۔ تو بی بی نے کہا۔ اب کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں دیکھو جو اُن کو ملا کر پوری پڑے۔ وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی۔ بس بعینہ جتنی ہماری حمیدہ۔ ماں جو لگی اُس کی بالیاں اُتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الہٰی اسوقت مجھ سے اس کی کچھ بھی مدد نہیں ہو سکتی فوراً خیال آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں ٹوپی بِک جائے تو شاید خانصاحب کا سارا قرضہ چُک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال تو سر کو لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اُس نے چھ کی آنکی[3]۔ میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا لا بلا سے چھ ہی دے۔ غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی سات تو روپے لے۔ میں نے چپکے سے اُس عورت کے ہاتھ پر رکھدئیے۔ تب تک پیادے خانصاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ اس عورت پر ایک شادی مرگ[4] کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اُس خوشی میں اُس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ہے۔ فوراً اپنے ہمسائے کو روپے

[1] یعنی حساب بیباق ہو جائے۔ [2] مالیت [3] قیمت لگائی۔ [4] ایسی خوشی جس سے انسان مرنے کے قریب ہو جائے۔

دے کر دوڑا[1] آیا اور خود بچوّں سمیت دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خانصاحب چھوٹ آئے تو بچوّں کو کیسی خوشی۔ کہ کودیں اور اچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پاس ایک۔ اب اُس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوّں سے بولی کمبختو! کیا اُدھم مچائی ہے (اور میری طرف اشارہ کر کے کہا) دُعا دو اُس اللہ کے بندے کی جان ومال کو جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اس کو تمہارا درد[1] دھ ہوتا۔ اور اس مصیبت کے وقت تمہاری دستگیری[2] کرتا؟ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا ہے کہ اللہ رکھے اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت سے مزدوری سے خدا کا شکر ہے۔ روکھی سوکھی روز کے روز دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت ملے تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان۔ نہ رشتہ نہ ناطہ اور اُس اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپے دے کر آج ہم سب کو نئے سر سے زندہ کیا۔ وہ بچے جس شکر گذاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے اُس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی جیسی کہ اُس دن تھی۔ مگر دونوں میاں بیوی کے ذہن میں اُسوقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ اُن کو دے دیا وہ سمجھتے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ میں کھسکنے کو تھا مگر وہ عورت

[1] ہمدردی۔ [2] مدد

زبردستی مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی میں
ہر چند منع کرتا رہا جلدی سے اُس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ کر مجھ کو بیٹھنے
کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی۔ نوج کوئی تم جیسا بے خبر ہو۔ کھڑے کیا
ہو۔ جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کے لئے بنوا لاؤ۔

میں۔ نہیں میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو۔

عورت۔ بیٹا! تمہاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف۔ جی چاہتا ہے
کہ آنکھیں تمہارے تلووں میں بچھا دوں۔ قربان اِس پیاری پیاری صورت
کے۔ نثار اِس بھولی بھولی شکل کے۔ بیٹا۔ تم یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟

میں۔ میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔

عورت۔ پھر بیٹا! یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لو گے؟ ہم اپنا اور
بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمہارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے۔
مگر کام اِن دنوں مندا ہے۔ دینگے تو ہم جس طرح بن پڑیگا دُو ہی مہینے
میں مگر جہاں اِتنی مہربانی کی ہے للٰہ اتنا سلوک اور کرو کہ دو دو روپے
مہینہ قسط کا لے لیا کرو۔

میں۔ آپ روپئے کے ادا کرنے کا کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں لے لینے
کی نیّت سے نہیں دیا۔

یہ سُن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کرسکتا
میں اُن میں اِس وقعت[1] کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا

[1] عزّت۔

میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مریدانِ ارادت مند میں کوئی پیر و مرشد۔ اُس عورت
کے مُنہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار
میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں کو لگاتی تھی اُسی
کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اُس نے دیکھا کہ میرے سر پر
ٹوپی نہیں۔ پوچھا۔ تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا۔ پھر
تو اُسکا یہ حال تھا کہ بچھی[۱] جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی۔ مگر
اُس نے مجھے سینکڑوں ہزاروں ہی دعائیں دی ہونگی۔ اُس نے جو اتنی
احسان مندی ظاہر کی میں اُلٹا اُسی کا ممنون ہوا۔ جسقدر وہ خوشامد کرتی
تھی میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی میں زمین میں
گڑا جاتا تھا۔ غرض میں وہاں سے رخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے
سیدھا گھر لوٹ آیا۔ عین گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے
میری ہیئت[۲] کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ ایں۔ کیا ٹوپی کے بدلے
چنے لے کھائے۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اِس واسطے کہ مجھ کو اِس بات
کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ شام کو بھائی جان سے اور اماں جان سے تکرار
ہوئی۔ بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے۔ اور اماں جان کہتی تھیں کہ بیٹا
اِن فضول خرچیوں سے گھر کے دن چلے گا۔ لو پرسوں میں نے تم کو چار
روپے دیئے تم نے چاروں کے چاروں برابر کیئے۔ ناخن بھر چیز تم گھر
میں لائے ہو تو بتا دو؟ اتنا چٹورا پن۔ ایسا اسراف[۳]! بھائی جان نے کہا۔

۱؎ بہت عاجزی کرتی تھی۔ ۲؎ ظاہرا حالت۔ ۳؎ فضول خرچی۔

میں چٹورا نہیں ہوں۔ چٹورے تمہارے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو۔ کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔ اماں جان نے مجھ کو بُلا کر پوچھا۔ میں نے کہا۔ اگر بیچ کر کھا جانا ثابت ہو جائے تو چور کی سزا وہ میری سزا۔

اماں جان۔ پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں۔ کھوئی بھی نہیں۔

اماں جان۔ بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے۔ بیچی نہیں۔ کھوئی نہیں۔ پھر ٹوپی گئی تو کہاں گئی؟

میں۔ اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجئے کہ میں نے کہیں اُسکو بے جا طور پر صرف[1] نہیں کیا۔

اماں جان۔ اگر یہی تمہارے لچھن[2] ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا میں اُس وقت عجیب مشکل میں مبتلا تھا۔ ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور بے ظاہر کئے بن نہیں پڑتی۔ گویم[3] مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو گو بالفعل[4] بھائی جان کے کہنے اور میرے چُپ رہنے سے اماں جان کو ایک بدگمانی ہو گئی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور اُن کے دل سے خدشہ[5] دفع ہو ہی جائیگا اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر ضرور سمجھ لینگی کہ بیٹا بدراہ

[1] خرچ [2] چال چلن [3] کہوں تو مشکل نہ کہوں تو مشکل [4] فی الحال۔
[5] شُبہ۔

نہیں ہے۔ نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے۔ سو خدا کی قدرت۔ ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو اماں جان اُس کی عیادت[1] کو گئیں۔ میں اُن کے ساتھ تھا ابھی اماں جان سواری سے نہیں اُتری تھیں کہ اُدھر سے وہی خانصاحب چلے آ رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر دُور ہی سے دعائیں دینے لگے۔ اور ایسے تپاک[2] اور دلسوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی جیسے کوئی اپنا بزرگ اور اپنا عزیز دریافت حال کرتا ہے۔ خیر میں نے تو مناسبِ حالت جواب دیا۔ اماں جان آخر یہ سب باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سُن رہی تھیں۔ اُترتے کے ساتھ ہی مُجھ سے پوچھا۔ علیم! یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کرتا تھا؟

میں۔ یہ ایک خانصاحب ہیں۔ اور میاں مسکین کے کوچے میں رہتے ہیں بس میں اسی قدر جانتا ہوں۔

اماں جان۔ لیکن یہ باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔

میں۔ نہیں! شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں۔

اماں جان۔ پھر تمہارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے؟

میں۔ بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف[3] میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میرے جواب سے اماں جان کی تشفی نہیں ہوئی مگر اندر جانے کی جلدی تھی چلی گئیں۔ خانصاحب نے

---

[1] حال پوچھنا۔ [2] محبت [3] جان پہچان۔

کہیں اپنے گھر میر آتذکرہ جا کیا۔میں تو گھر چلا آیا۔مگر غالب ہے کہ اُن کی بیوی اماں جان کے پاس گئیں اور میرے اُس ٹوپی بھیجنے اور روپے دینے کا تمام ماجرا بیان کیا۔پھر جو اماں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں۔علیم ہم نے تمہاری چوری آخر پکڑ ہی پر پکڑ لی۔میں نے حیران ہوکر پوچھا۔کہ میری چوری؟

اماں جان۔جی ہاں چوری۔

میں۔بھلا میں بھی سُنوں۔

اماں جان۔کیوں۔پہلے تم ٹوپی کا حال بتاؤ تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سُنو۔اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپکا ہو رہا۔

باپ۔بے شک جتنی باتیں تم نے بیان کیں داخلِ ہمدردی ہیں۔خصوصاً یہ خانصاحب کا قصہ ہمدردی کی ایک اعلیٰ درجے کی مثال ہے لیکن چشمے سے پہلے وہ سیراب ہونے چاہئیں جہاں سے وہ چشمہ نکلا ہے۔اسی طرح پہلے اپنے عزیز و اقارب[1] نیکی اور سلوک کے مستحق ہیں۔

بیٹا۔میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرے قریب کے رشتہ دار میرے سلوک کے حاجتمند نہیں ہیں۔اور خدا نے اُن کو مجھ سے بے نیاز اور مستغنی[2] کیا ہے۔

باپ۔کیا سُلوک صرف روپے پیسے ہی کے دینے سے

---

[1] رشتہ دار [2] بے پرواہ۔

ہوتا ہے؟

بیٹا۔ میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا۔

باپ۔ نہیں جو جس چیز کا حاجت مند ہے اُس کا رفع حاجت کرنا ہمدردی اور نفع رسانی ہے۔ ہمارا خاندان دینداری سے بے اور خداشناسی سے بے نصیب ہے اور شیوۂ خدا پرستی میں ہر ہر متنفس[1] کو تعلیم و تلقین[2] کی حاجت اور وعظ و نصیحت کی ضرورت ہے۔ تم نے اس فرض کو ادا کرنا تو درکنار ابھی تک فرض ہی نہیں سمجھا۔

بیٹا۔ آپ بجا فرماتے ہیں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔

(از توبۃ النصوح)

ابن الوقت نے نوبل صاحب کے ساتھ میز پر چھری کانٹے سے کھانا کھایا

دربار کے مجمع میں نوبل صاحب نے اپنا وقت ملاقات بتا ہی دیا تھا۔ دربار کے تیسرے دن ابن الوقت ٹامس صاحب کی کوٹھی پر جا موجود ہوا۔ کوٹھی بجائے خود ایک چھاونی کے تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ زرد بنگلے میں ہیں۔ بنگلے کا احاطہ الگ تھا۔ دیکھتا کیا ہے

---

[1] آدمی۔ [2] ہدایت۔

کہا حاطے کے بیرونی دروازے پر ملاقاتیوں کی سواریاں کھڑی ہیں
دروازے کے اندر چھوٹا سا وسعت پیش صحن کے مناسب چمن خوبصورت
آراستہ اور استے ہی سے چمن میں چار مالی کام کر رہے ہیں۔ درختوں کی
شادابی۔ سڑکوں کی صفائی۔ روشوں کی درستی کہے دیتی ہے کہ مالی
صرف نوکری کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے شوق سے بھی کام میں لگے
لپٹے رہتے ہیں۔ پر ہاں کیاریوں کی قطع اور درختوں کے انتخاب سے
ایک خاص سلیقہ اور مذاق ظاہر ہوتا ہے جو کسی مالی کے بس کا نہیں۔
ابن الوقت چمن سے جابجا رکتا ٹھٹکتا برآمدے تک پہنچا تو ملاقاتیوں
کا ہجوم تھا بعض کرسیوں پر تھے بعض فرش پر اور بعض (شائد امیدوار
ہوں) برآمدے کے دونوں طرف نیچے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔
نوبل صاحب کے آدمی ابن الوقت کو پہچان تو چکے ہی تھے۔ آتا ہوا دیکھ کر
سب نے اُسے کھڑے ہو کر سلام کیا اور اتنی اُس کے ساتھ خصوصیت
برتی کہ الگ کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چپراسی
نے آ کر خبر دی کہ صاحب کو آپ کی اطلاع ہو گئی ہے۔

ابن الوقت۔ پھر صاحب نے کیا فرمایا؟

چپراسی۔ آپ نے دیکھا کتنے آدمی آپ سے پہلے کے
آئے ہوئے بیٹھے ہیں۔

ابن الوقت۔ کیا یہ سب ہو لینگے تب میرا نمبر آئیگا؟

چپراسی۔ ان لوگوں کی ملاقات چار چار یا پانچ پانچ منٹ

بلکہ صاحب نے آپ کا آنا تو سُن ہی لیا ہے۔ لوگوں کو جلد جلد رخصت کر ینگے کیا کہیں صاحب ہمارے صاحب کا مزاج اسی طرح کا ہے کہ کوئی اکھڑا ہوا تو اُس کو جواب نہیں دیتے۔ ملنے کے تو بڑے وحشی ہیں اور اسی وجہ سے ہم لوگوں کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ ورنہ اب تک کبھی کے آپ کے سلام کو حاضر ہوئے ہوتے۔ اتوار کو ضرور سارے شاگرد پیشہ حاضر ہونگے۔ سب لوگ بڑی آس لگائے ہوئے ہیں۔

ادھر نوبل صاحب اپنی جگہ ابن الوقت کے خیال سے اتنے میں ۲-۲ ہی دُو باتیں کر کے لوگوں کو اوپر تلے ٹال رہے تھے۔ پھر بھی ابن الوقت کو آدھ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا ہی پڑا۔ اس کی ملاقات نوبل صاحب کے ساتھ ایسی حالت میں شروع ہوئی کہ نوبل صاحب کی اسوقت کچھ ہستی ہی نہ تھی۔ اس کے بعد سے جب نوبل صاحب ملے منصبی اور قومی تعزز ہر حال میں اُن کے ساتھ تھا۔ خواجہ باقی باللہ کی سڑک پر جبکہ ابن الوقت بیگار میں پکڑا ہوا ایک گٹھر اٹھانے کو تھا۔ تو نوبل صاحب کو اُس نے دیکھا کئی انگریزوں کے ساتھ عربی گھوڑے پر سوار۔ پھر دربار میں دیکھا تو دربار کا اہتمام کرتے ہوئے انگریزوں میں پیش پیش۔ پھر آج اپنے بنگلے پر کہ ملاقاتیوں کی سواریاں دروازے پر کھڑی ہیں۔ اور شہر کے بیسیوں رئیس سلام کے منتظر حاضر۔ شاگرد پیشہ لوگوں کی یہ کثرت کہ احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ معلوم ہوتا ہے ہر قسم کی متعدد سواریاں احاطے کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک بھی

پڑی ہیں۔ بنگلے کے تمام کمرے۔ فرش۔ پردہ چلمن۔ میز کرسی۔ شیشہ آلات اور آرائش و آسائش کے سامان سے سجے ہوئے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے کہ غدر کے دنوں میں اس کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت تک باقی نہ تھی۔ یا اب دو ہی مہینے میں نئے سرے سے مکان بھی بن گیا رنگ بھی پھر گیا۔ اور ہر طرح کا سامان بھی مہیا ہو گیا۔ باغ بھی لگ گیا یعنی جہاں کچھ نہ تھا وہاں سب کچھ ہو گیا۔ چار چپراسی اور پانچواں جمعدار اتنے آدمی صاحب کے کمرے سے ایک کمرہ چھوڑ کر دروازے سے لگے بیٹھے ہیں۔ اندر سے ذرا سی آواز آئی اور دوڑے۔ نوبل صاحب کی یہ شان اگرچہ ابن الوقت کو پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر اس بات کا اس کو حق الیقین تھا کہ ایک غدر نہیں ایسے ایسے ہزار غدر کیوں نہ ہوں۔ انگریزی عملداری جانے والی نہیں بلکہ غدر کے بعد جو تسلط بیٹھے گا پہلے سے زیادہ مستحکم اور پائدار ہو گا۔ وہ خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی انگریز بلکہ کوئی کرانی بھی نوبل صاحب کی طرح بھیگی بلی بنا ہوا بیٹھا ہے وہ حقیقت میں شیر ببر ہے۔ فی الحال گرد و غبار ہے اور باعتبار مآل سوار۔ مگر ابن الوقت کی خودداری ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ نہ تو اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جو لوگ عزت میں، مقدرت میں اور شاید سرکاری خیر خواہی میں بھی اس پر ہر طرح ترجیح رکھتے ہیں۔ برآمدے میں بٹھائے گئے ہیں اور یہ کمرے میں اور نہ اس پر نظر کی کہ جو لوگ آنے میں اس سے اقدم[1] ہیں از روئے

---

[1] پہلے۔

انصاف ان کو ملاقات میں بھی اقدم ہونا چاہیے۔ آدھ ہی گھنٹے کے انتظار
میں یہ ایسا اُکتایا کہ بار بار چپراسیوں سے ترش روئی کے ساتھ پوچھتا تھا
کہ اب کتنے آدمی اور ہیں؟ کہیں تم نے میری اطلاع میں یا صاحب نے
سمجھنے میں تو غلطی نہیں کی؟ اسکو اپنے زعم میں منتظر بٹھلائے جانے سے خجالت
تھی اور وہ اُس خجالت کے ٹالنے کو کمرے میں ٹہلتا اور کتابوں اور
تصویروں اور دوسری چیزوں کو اٹھا کر جگہ سے ہٹا کر دیکھتا۔ اگرچہ اس
نے کسی چیز کو بے ٹھکانے نہیں کیا مگر چپراسی اس کی یہ آزادی دیکھ کر دل
میں بہت ناخوش تھے اور دُور ہٹ کر چُپکے چُپکے آپس میں کہتے تھے یہ
بھی عجب آدمی ہے کہ ایک دم اِس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا اس کو کمرے
میں بٹھانا ہی نہیں تھا۔

جمعدار۔ میاں ہوش کی بنواؤ تمہیں خبر بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟ غدر
میں صاحب انھیں کے گھر میں تھے۔ ان کو برآمدے میں بٹھا دیتا اور صاحب
کی نظر پڑ جاتی تو سب کی شامت آجاتی۔

چپراسی۔ جی جمعدار! خیر خواہی کی تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ پر
سرکار دربار کا کچھ ادب بھی ہے یا نہیں۔ حاکم کی ڈیوڑھی پر امیر، رئیس،
راجہ، بابو، نواب، زمیندار سبھی آتے ہیں۔ اندر جا کر چاہے صاحب کی
گود میں بیٹھتے ہوں۔ پر باہر تو ہم نے سب کا ایک ہی قاعدہ دیکھا ہے
ہاتھ باندھے سر جھکائے چُپ چاپ، کل تم نے لوہارو والے نواب
کی طرف خیال نہ کیا ہوگا۔ صاحب کو غسل خانہ میں دیر لگی تو اُسی کمرے

میں تھے۔ کھانسی اٹھی تو آواز کی گونج کے ڈر کے مارے کھڑکی کے باہر مُنہ نکال کر اور رومال رکھ کر کھانسے اور میں نے اگالدان لانے کو پوچھا تو اشارے سے منع کر دیا۔

جمعدار۔ کیا مضائقہ ہے ان کو صاحب لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق نہ پڑا ہوگا۔

چپراسی۔ میں تو انعام لینے جاؤنگا۔ تو ضرور اتنی بات اِن کے کان میں ڈال دونگا۔

جمعدار۔ نہیں جی تمہیں کیا پڑی ؟

چپراسی۔ مجھے پڑی یہ۔ کہ اب اِن سے صاحب سے ٹھہری خصوصیت اِن کا روز کا نہیں تو تیسرے چوتھے دن کا پھیرا ضرور ہوا کریگا اور ہمارے صاحب کے پاس باہر کے ایک دو صاحب لوگ ہمیشہ ٹھہرے ہی رہتے ہیں۔ بعضا انگریز ایسا بدمزاج ہوتا ہے کہ کالے آدمی کی صورت سے جلتا ہے وہ اگر ایسی بدتمیزی دیکھ پائے تو ڈِک سے یا بُوٹ کی ٹھوکر سے خبر لے۔ انہیں کی نہیں بلکہ ہم لوگوں کی بھی"۔

اِتنے میں نوبل صاحب کے باہر نکلنے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ سارے چپراسی اور جسقدر لوگ ملاقات سے رہ گئے تھے سب کے سب ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ جو شخص صاحب کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر سے آئے تھے، وہ دروازے سے سلام کر کے رخصت ہوئے باقیوں کو صاحب سلامت کے بعد صاحب نے رخصت کر دیا۔ کہ آج

دیر بہت ہو گئی اور خود ابن الوقت کے کمرے میں چلے گئے۔ پہلی بات جو صاحب نے ابن الوقت سے کہی یہ تھی۔ کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آپ کے شہر میں مخبری کا بازار اسقدر گرم ہو رہا ہے کہ جس نے کچھ نہیں کیا وہ بھی خوف کے مارے پریشان ہے کہ دیکھئے کوئی کیا جا کر لگا دے اور حکام کی نظر ہے سخت، اس سے لوگ اور بھی ہراساں ہیں۔ ابن الوقت کچھ کہنا چاہتے تھے کہ صاحب بول اٹھے۔ مجھ کو آپ سے بہت دیر باتیں کرنی ہیں اور کھانا بھی میز پر رکھا جا چکا ہے۔ چلئے کھاتے بھی جائیں اور باتیں بھی کرتے جائیں۔

ابن الوقت۔ میں کچھ وقت کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ آپ کھائیے۔ میں گھر جا کر کھا لونگا۔ اور ابھی کچھ ایسا وقت بھی نہیں ہوا۔

نوبل صاحب۔ (مسکرا کر ابن الوقت کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف کو چلتے ہوئے) کیوں کیا آپ کو میرے ساتھ کھانے میں کچھ احتراز ہے؟ میں وہی نوبل ہوں کہ میں نے اور آپ نے مہینوں ایک جگہ کھانا کھایا ہے اور آپ کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ میں اُسوقت بھی ایسا ہی عیسائی تھا جیسا غدر سے پہلے اور جیسا اب ہوں اور جیسا خدا نے چاہا اس کی مدد سے مرتے دم تک رہونگا۔

ابن الوقت۔ نہیں مجھے اپنی ذات سے تو اعتراض اور احتراز کچھ بھی نہیں۔ مگر لوگ اسکو برا سمجھتے ہیں۔

نوبل صاحب۔ مگر آپ بھی اس میں کچھ برائی پاتے ہیں یا نہیں؟

ابن الوقت۔ نہیں ہیں تو ہرگز کسی طرح کی کوئی برائی نہیں پاتا

نوبل صاحب۔ ہندوستان کو جس کمزوری نے تباہ کیا اصل میں وہ یہی کمزوری ہے۔ خدا نے جیسی ان کی طبیعتیں بودی اور محکوم بنائی تھیں ویسے ہی یہ لوگ سدا سے بودے اور محکوم رہتے چلے آئے اور جب تک یہ کمزوری ان کی طبیعتوں میں ہے آگے کو بھی ضرور بودے اور محکوم رہیں گے۔

ابن الوقت کو پہلے ہی سے انگریزوں کی طرف رجحان تھا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ نوبل صاحب کا اشارہ پاتے ہی مقابل کی کرسی پر ڈٹ ہی تو گیا اور یہ عیسائیت کا نہیں بلکہ اس کی انگریزیت کا گویا اصطباغ تھا جسن اتفاق سے اسوقت میز پر کوئی انگریز نہ تھا۔ یوں تو کئی صاحب ان کی کوٹھی پر ٹھہر رہے تھے۔ مگر سب کے سب مل کر شکار کھیلنے چلے گئے تھے۔ اور بہت بہتر ہوا کہ نوبل صاحب اکیلے تھے ورنہ آج ابن الوقت کی خوب ہی ہنسی اڑی ہوتی۔ اس نے ناواقفیت کی وجہ سے کھانے میں ایسی ایسی بے تمیزیاں کیں کہ وہ نوبل صاحب ہی جیسا متین آدمی تھا کہ نہ تو اسے ہنسی آئی اور نہ اسنے کچھ برا مانا۔ ہنسنے کو کھانا کھلانے والے خدمتگار کیا کم تھے۔ مگر نوبل صاحب کے ڈر کے مارے کسی کی مجال نہ تھی کہ مسکرا بھی لیتا۔ ہنسنا تو بڑی بات ہے۔ ابن الوقت کی بیجا حرکتیں دیکھتے اور دوسرے کی طرف کنکھیوں سے نظر کر کے رہجاتے۔ پر اپنی جگہ جا کر تو مارے ہنسی کے ضرور لوٹ لوٹ گئے

ہو گئے۔ اس نے بے تمیزی سے بے تمیزی یہ کی کہ داہنے ہاتھ میں کانٹا
لیا اور بائیں ہاتھ میں چھری۔ پھر نوبل صاحب کے بتانے سے کانٹا بائیں
ہاتھ میں لیا تو چھری کو اس زور سے کانٹے پر ریت دیا کہ چھری کی ساری
باڑھ جھڑ پڑی۔ خدمتگار نے میز پر سے دوسری چھری اٹھا کر دی۔ شاید آلو ہی
تھا کہ اس کو کاٹنے لگا تو اچھل کر بڑی خیر ہو گئی کہ ٹیبل کلاتھ (دسترخوان)
پر گرا پھر جب کسی چیز کو کانٹے میں پرو کر منہ میں لے جانا چاہتا تھا ہمیشہ
نشانہ خطا کرتا اور جب تک باری باری سے ناک اور ٹھوری اور کلے
یعنی تمام چہرے کو داغدار نہیں کر لیتا کوئی لقمہ منہ میں نہیں لے جا سکتا
اس دن کھانے کے بعد کوئی اسکا منہ دیکھتا تو ضرور یہی پھبتی کہتا کہ چہرہ
ہے یا دیوالی کی کلھیا ہے۔ اس نے کہا تو نہیں مگر اس کی سسکی سے
کئی دفعہ ایسا بھی شبہ ہوا کہ ہونٹوں میں یا مسوڑھوں میں یا زبان میں کہیں
کانٹا ضرور چبھا۔ پھر اول مرتبہ خدمتگار چھوٹی رکابی سامنے سے اٹھانے
لگا تو اس نے سمجھا کہ بس دسترخوان بڑھانا چاہتا ہے۔ کچھ کہنے ہی کو
تھا۔ خدمتگار تھا سلیقہ مند سمجھ گیا اور یہ کہہ کر رکابی آگے سے کھینچ چلتا
ہوا۔ کہ دوسری صاف پلیٹ لاتا ہوں۔ تمام کھانے میں چھ یا سات
رکابیاں بدلی گئیں۔ مگر اس بندۂ خدا نے چھری کانٹا ہاتھ سے نہ چھوڑا
جب تک خدمتگار نے منہ پھوڑ کر نہیں مانگا۔ جب خدمتگار پہلی قعب
اس کے برابر لایا تو اس نے دونوں کنارے پکڑ کر ساری قعب اس
کے ہاتھ سے لے مچے سمیت اپنے آگے رکھ لی۔ خدمتگار نے کان میں

جھک کر کہا۔ کہ اس میں سے جتنا آپ کو درکار ہو چمچے سے اپنے سامنے کی رکابی میں لے لیجئے۔ پڈنگ کانٹے سے کھانے کی تھی۔ اسکو جو لگی مزے کی چمچے سے ہڑپ اور اس پر مزہ یہ کہ ذرا سی اور دینا۔ اخیر میں سب سے زیادہ بیہودہ بے تمیزی جو کی یہ تھی۔ کہ فنگر گلاس کا پانی اٹھا پی لیا۔ ابن الوقت کی بعض حرکتیں حقیقت میں سخت بیجا تھیں۔ مگر واہ ری شرافت۔ نوبل صاحب شروع سے آخر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ گویا کچھ خبر ہی نہیں۔ مگر نیچی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں ضرور پشیمان ہوئے ہونگے کہ میں نے ناحق اسکو کھانے میں شریک کیا۔ انکی پشیمانی اس خیال سے ان کو ضرور زیادہ ہوئی ہوگی کہ ایسی خصوصیت پر کیونکر ہو سکتا تھا کہ عین وقت پر کھانے کی تواضع نہ کرتا۔ تواضع کرنا تو مناسب بلکہ واجب تھا۔ اور اب تواضع کی تو آگے کو ایک رستہ کھلا اور بھلے کو آج کوئی انگریز کھانے میں شریک نہ تھا اور ہوتا تو ساری عمر ان کی بے تمیزیوں کی نقلیں کر کر کے مجھ کو چھیڑا کرتا۔ ضرور نوبل صاحب جب تک میز پر رہے اسی فکر میں تھے کہ انہوں نے ابن الوقت کے ساتھ مطلق کسی قسم کی بات نہیں کی۔ ورنہ نوبل صاحب کی میز کے چہچہے تمام چھاؤنی میں مشہور تھے۔ خیر کھانے کے بعد نوبل صاحب نے ایک خدمتگار کو اشارہ کیا کہ آپ کو غسلخانے میں لے جا کر ہاتھ دھلواؤ۔ وہاں سامنے سنگھار میز پر قدِ آدم آئینہ لگا تھا۔ ابن الوقت نے جاتے ہی اپنا عکس دیکھا تو بے ساختہ انشاء اللہ خاں کا وہ مقولہ یاد آگیا۔ ع

اسپیسعول

ڈاڑھی کو لگا شیخ کی اب بھر قطونا اور بجنے لگی گت

بارے ہاتھ منہ دھوا اور آدمیوں کی جُون میں آکر پھر نوبل صاحب کے پاس آیا۔ نہ جاننا بھی عجب مزے کی چیز ہے۔ ابن الوقت اتنا بھی تو متنبہ نہ ہوا کہ معذرت کرتا۔ نوبل صاحب نے تو اپنے لئے پائپ بھر لیا تھا ابن الوقت کی طرف سگرٹ کا بکس سرکا دیا کہ اس میں جو تمباکو ہے روم کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے اور چُرٹ کے مقابلہ میں بہت ہلکا ہے۔ آپ بے تامل پیجئے۔ اور جب آپ چند روز اس کی عادت کیجئے گا تو میں یقین کرتا ہوں کہ اس کے سامنے آپ حقّے کو مُنہ بھی نہ لگائیں گے میں صبح و شام اور کھانے کے وقت تو پائپ پیتا ہوں اور باقی اوقات یہی سگرٹ۔ ابن الوقت گڑ کھا چکا تو گلگلوں سے کا ہے کا پرہیز؟ دیا سلائی سُلگا۔ لگا انجن کی طرح بھق بھق مُنہ سے دھواں نکالنے۔

(از ابن الوقت)

حالی

سنہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت ضلع کرنال میں ان کی ولادت ہوئی۔ جہاں ان کے بزرگ ہرات سے تشریف لانے کے بعد مستقل طور پر مقیم تھے عربی، فارسی میں علوم مروّجہ کی تحصیل کے بعد سترہ برس کی عمر سے دہلی میں رہے اور منطق و فلسفہ وغیرہ کی تکمیل کی۔ اُس عہد میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحبِ علم ہونے کے علاوہ جواہر قابلہ کے سرپرست و مربی بھی تھے۔ حالی ان کے صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ حالی کی ادبی زندگی پر نواب شیفتہ کی ادبی صحبتوں کا زیادہ اثر پڑا اور اِس تعلق کی بناء پر غالب کی خدمت میں بھی باریابی نصیب ہوئی۔ غالب نے ان کی طبیعت کا اندازہ کر کے کہا۔ کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو ظلم کرو گے چنانچہ یہ مرزا غالب کے شاگرد ہو گئے۔

ابتدا میں حالی کی شاعری بھی روشِ قدیم کی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب انھیں پنجاب بکڈپو لاہور کی کتابوں کی عبارت زمانۂ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت ملی تو خیالات تبدیل ہوئے۔ اسی اثناء میں آزاد نے جدید شاعری کا مشاعرہ قایم کیا جس میں حالی نے آزاد کا ہاتھ بٹایا اور

خود بھی متعدد نظمیں لکھیں۔ پھر عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد سے وظیفہ ملنے پر اسکول سے علیحدگی اختیار کر لی اور آخر دم تک ملک و قوم کی اصلاح کے لئے نظم و نثر کے میدانوں میں گامزن رہے۔

حالی طرزِ جدید کے قائد اور اردو شاعری کے مصلح سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا کلام اصلاح کے جذبات سے بھرا ہوا ہے جسے زبان کی سلاست اور بیان کی شیرینی اور بھی موثر بنا دیتی ہے۔ اس معجز بیانی کی وجہ سے انہیں سعدیِ ہند کہا جاتا ہے۔

حالی کو نظم و نثر دونوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ نثر کی کتابوں میں یادگارِ غالب۔ حیاتِ جاوید۔ مقدمۂ شعر و شاعری اور حیاتِ سعدی خاص طور پر مشہور ہیں۔ نظم میں مسدس حالی مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا مرثیہ ہے جس میں مسلمانوں کو علم و عمل کے میدان میں آنے پر آمادہ کیا ہے اس کے علاوہ دیوانِ حالی۔ مناجات بیوہ اور بہت سی نظمیں یادگار ہیں۔

۱۹۰۴ء میں حالی کو سرکار انگریزی سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا اور ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔

مرزا غالبؔ کے اخلاق وعادات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر ومحبت وغمخواری ویگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص ومخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اُن کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے۔ مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہانتک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سُنّت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کرونگا۔"

باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھدیا تھا کہ "آپ نے بسبب ذوقِ سخن کے اشعار کی اصلاح منظور فرمائی تھی"۔ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں: "لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اِن کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد اِن کی

آمد لی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ہوگئی تھی۔ اور کھانے پہننے کا خرچ
بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ
کرتے تھے اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے
خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسب معمول سات پارچے
کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے
کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام
دینا ہوگا۔ اس لئے اُنہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر
بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیجدی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان
میں بٹھا دیا۔ اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام
دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے
تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلّی کے عمائد[1] میں سے
ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی حالت
سقیم[2] ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل[3] پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو
آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا
غیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھ کر دل
بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی مجھے اسکی
وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ

[1] امیروں۔ [2] خراب۔ [3] روئی بھرا ہوا اچکن کی طرح کا لبادہ۔

منگوادیں۔ انہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت
اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا کہ جی تو یہی
چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں۔ مگر جاڑا شدت سے
پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔ پھر اِدھر
اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چُغہ اتار کر اُنہیں پہنا دیا اور
اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چُغہ ان کی نذر کیا۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا۔ مگر خودداری اور حفظ
وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی
ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر
میں سے جو لوگ اُن کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی اُن کے
مکان پر نہیں جاتے تھے۔ اور جو شخص اُن کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُس
کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خاں
مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب
نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا
مرزا نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا۔ اس لئے اوّل وہاں گیا تھا وہاں
سے یہاں آیا ہوں۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم مرزا کے مکان کے پاس سے
بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو
لکھا۔ مضمون یہ کہ "آج مجھ کو اسقدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے

زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اسطرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔"
جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہوکر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

تذکرۂ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قایم کیا گیا، مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے۔ اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے لوگوں نے مرزا۔ مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہوکر صاحب سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق سکریٹری اُن کے لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے۔ وہ خود باہر چلے آئے۔ اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا۔ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز

میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے
کہا مجھ کو خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

غدر کی مصیبتیں

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے
جونہیں بغاوت کا فتنہ اٹھا اُنہوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور
گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ فتح دہلی کے
بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُن کے ہمسایوں
کے مکان پر جس میں ایک مرزا بھی تھے، حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا
تھا۔ اس لئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے
مگر پھر بھی ان کو طرح طرح کی کلفتیں اٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے
بھائی چونتیس ۳۴ برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور آخیر دم تک اسی
حالت میں رہے۔ جب مرزا نے دلّی میں سکونت اختیار کی تو اُن کو بھی
اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے اُن کا مکان تقریباً
دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں
عمر رسیدہ تھے اُن کے پاس رہتے تھے۔ جب دلّی فتح ہو گئی اور شہر اہلِ
دہلی سے خالی ہو گیا اور رستے بند ہو گئے اُس وقت مرزا بھائی کی طرف
سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے، سونے، مرنے
اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان

میں کچھ سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا۔ یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گذرے مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا اُس وقت نہ کفن کے لئے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا نہ غسّال[1] اور نہ گورکن[2] کا کہیں پتہ تھا۔ نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا مگر مرزا کے ہمسایہ نے اُن کی بڑی مدد کی۔ پٹیالہ کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لے کر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں جو مکان کے قریب تھی دفن کر دیا۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے۔ راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر انہوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "انہوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا۔ مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براؤن کے روبرو جو میرے مکان کے قریب مقیم تھے، لے گئے۔ کرنل براؤن نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا۔ اور ہم کو رخصت کر دیا۔"

سنا ہے کہ جب مرزا کرنل براون کے روبرو گئے تو اُس وقت

[1] مُردے نہلانے والا [2] قبر کھودنے والا۔

کلاہ پیاخ اُن کے سر پر تھی۔ اُنھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ "ول تم مسلمان"۔ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا۔ اس کا کیا مطلب مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا"۔ کرنیل یہ سُن کر ہنسنے لگا۔ پھر کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُن کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

چونکہ اُسوقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا۔ مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا جو اُن کے پاس برابر آتے رہتے تھے۔ اور ہر طرح سے اُن کی غمخواری کرتے تھے۔ کوئی اُن کا غمخوار نہیں رہا تھا۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے۔ سرکاری پنشن اور قلعہ کی تنخواہ، سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہو گئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے۔ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اس کے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی، جب شہر لٹنے لگا تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیجد یا جہاں سے فتح مند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت[۱] کی حالت میں اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا۔ اور جو حالت ان پر اُن کے متعلقین[۲] پر خوش و ناخوش گذری اُس میں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں

۱؎ غریبی۔ ۲؎ ساتھیوں۔ رشتہ داروں۔

بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار وناچار سان کی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں:۔ "اس ناداری کے زمانے میں جسقدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔"

غالب کی اُردو نثر

مرزا کی اُردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین[1] نے لوازم نامہ نگاری سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں، سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ[2] بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں

---

[1] خط لکھنے والوں نے۔ [2] آمنے سامنے۔

روانہ ہوگئیں۔اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔میں نے پوچھا، کیا آج نہ جائینگی اس نے کہا آج ضرور جائینگی تیاری ہو رہی ہے۔اس مطلب کو اُنہوں نے اس طرح ادا کیا ہے: "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی۔تیاری ہو رہی ہے"۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور اُن سے یہ باتیں ہوئیں مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

میرن صاحب۔السلام علیکم۔حضرت آداب۔کہو صاحب آج اجازت ہے۔میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔

نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ بہت خفا ہوا ہوگا۔جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔آپ سے خفا کیا ہونگے۔بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ ایلو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں۔کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور

جب وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے۔ میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہ لکھا۔ لاحول ولاقوۃ۔" اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

مغربی طریقے پر جو قصّے لکھے جاتے ہیں ان میں اکثر اس قسم کے سوال جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل[1] اور مجیب[2] کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا اور جواب کہاں سے شروع ہوا۔

مرزا ایسے موقع پر سائل اور مجیب کا نام نہیں لیتے اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا۔ شاید قصّے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کردی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین

---

[1] سوال کرنے والا۔ [2] جواب دینے والا۔

رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رُتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً ایک اپنے دوست کو لکھا ہے اس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں:۔

"کیوں بھئی اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے۔ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں اُن کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعہ کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا اس طرح لکھتے ہیں:" اے مردمِ چشم جہاں بین غالب پہلے اس لقب کے معنی سمجھ لو چشم جہان بین غالب کی پُتلی۔ چشم جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر اور پُتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنہوں نے اس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں اُنکو اس طرح لکھتے ہیں:" دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزہ یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔

"دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے۔ اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں "حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا۔ تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھے رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، منہ پر ڈاڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔"

الغرض مرزا کے خطوط اور رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلینگے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں۔ یہانتک کہ رنج وافسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں۔ "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اسکو ماں سمجھا تھا۔ اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی۔ مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں: "صاحب تم جانتے ہو کہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے۔ کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش انکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب

کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اسکا نام بھی دلّی اور اور اس محلہ کا نام بھی بَلّی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود[1] البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔"

ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں "کل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان۔ یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہلِ حرفہ یا حکّام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور[2] جو بقیۃ السیف[3] ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اُمرائے اہلِ اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ اور نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمہارے

[1] ہندو کی جمع۔ [2] شاہی خاندان کے مرد۔ [3] جو تلوار سے بچ گئے۔

چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا[1] کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا
بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان
اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے
صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرتپور
چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانچسو روپے کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر
پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے
قصہ کوتاہ قلعہ، جھجر، بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش ۳۰ لاکھ
روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں[2] خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی
یہاں کیوں پایا جائے، جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے
صلحا[3] اور زہاد[4] کے باب میں جو صرف مختصر میں نے لکھا ہے اُس کو بھی
سچ جانو۔"

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و
بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے ان کے
خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں: "ناتوانی زور پر
ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب
میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ
موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخشدیا تو خیر اور اگر باز پرس
ہوئی تو سقر[5] مقر ہے اور حاویہ[6] زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں

[1] زندہ لوگوں کو [2] امیر خاندان [3] نیک لوگ [4] زاہد نیک [5] دوزخ ٹھکانا ہے [6] دوزخ کا گوشہ رہنے کو ملے گا۔

ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ زلیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوں تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحتِ جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی ہرچند وہ بھی وہم مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گذر پاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے ہستی نہیں ہے۔ پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔"

(از یادگارِ غالب)

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے۔ واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب چھبیس ۲۶ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاری اور اٹھارہ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطہ سے ملک محمود شاہ الملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اور اُس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لئے اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ

کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبۂ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا[1] و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت[2] مزارات آئمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت[3] عیدین ان سے مقرر کردی پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے۔ وہ انہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں، اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شُہدا پور کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی ہیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل[4] ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سن کہولت[5] میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا انہوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو مومن دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی[6] کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ و طب میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر

---

[1] قاضی کا عہدہ۔ [2] داماموں کے مزاروں کی نگرانی [3] عید کی نماز کا خطبہ پڑھنا۔ عیدین کے معنی رمضان کی عید اور بقر عید۔ [4] دماغ میں خلل آگیا تھا [5] ادھیڑ عمر [6] شادی۔

سے ایک نوع[1] کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوگیا۔ انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ اُن سے صرف و نحو پڑھی مگر چند روز بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلۂ والدین کے سمجھتا تھا، تأہل[2] پر مجبور کردیا۔ اسوقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جُوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود[3] ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا میں گھر والوں سے روپوش[4] ہوکر دلّی چلا گیا۔ اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔ اگرچہ اسوقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاصکر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اسقدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے مدرس اور طلبا رکالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی

---

[1] طرح۔ [2] شادی۔ [3] بند۔ [4] چھُپ کر۔

تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہتا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اُسوقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ برس اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بیکاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلاء سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا۔ اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاصکر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہیٰ صرف اسقدر ہے جسقدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر اُن کے اُردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو اُنہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے مگر اُس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حُسنِ اتفاق سے نواب مصطفٰے خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے۔ شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے اِن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع

ہوا تھا۔ اُنہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پُرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اُسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیسؔ کا ذکر ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے انیسؔ کے مرثیے کا یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے۔

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ اِن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔ اور

رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے۔ اُن کی اُردو عبارت دُرست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاصکر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنیل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پُرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعۂ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ کہ اِس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم کریں۔ میں نے بھی اُسی زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری اُمید پر تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حُبِ وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک سکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بطورِ خود اِسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی، لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم

میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔ چنانچہ میں نے اوّل مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شایع ہو چکی ہیں لکھیں۔

نظم کے سوا نثر میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب تریاق مسموم لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شایع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شایع کر دیا تھا۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسار لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی۔ اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور اُن کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شایع کیا جس کا نام حیاتِ سعدی ہے۔ اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شایع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک بسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شایع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں اُن کی فارسی اور اردو نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور

اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے۔ یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شایع کی اور اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے، لکھی۔ جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شایع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ لکھی ہیں۔ جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس۳۰ بتیس۳۲ مضمون بھی مختلف عنوان پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق۔ علیگڈھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شایع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسیقدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے، جو ہنوز شایع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اُسوقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے آخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔ اور اردو میں سب سے آخیر وہ نظم ہے جو حال میں وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جبکہ اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر عثمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علیگڈ کالج کے لئے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علیگڈھ میں فروکش ہوئے تھے۔ اور میں بھی اُسوقت علی گڈھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا۔ اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر

ممبران ڈیپوٹیشن علیگڈھ کالج حیدرآباد دکن گیا تھا۔ اُس وظیفہ تین پچیس[۲۵]
روپے ماہوار کا اضافہ کرکے سو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے
مقرر کردیا۔ جواب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے۔ اور
اسی وقت سے میں نے انیگلو عربک اسکول سے قطع تعلق کرلیا ہے۔

آزاد

محمد حسین نام اور آزاد تخلص ہے۔ آزاد کی ولادت ۱۸۲۹ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی محمد باقر صاحب شرفائے دہلی میں سے تھے اور خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ اُردو زبان میں سب سے پہلا اخبار مولوی محمد باقر صاحب نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری کیا۔ جو ۱۸۵۷ء تک باقاعدہ نکلتا رہا۔ استاد ذوق سے ان کے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے آزاد ابتدائے سن شعور سے اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر رہے اور شعر و سخن کی محفلوں سے مستفید ہوتے رہے۔ اس کے بعد قدیم دہلی کالج میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اُردو نظم و نثر لکھنے میں اُن کی شہرت زمانۂ تعلیم ہی میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہر سال کالج کے امتحانوں میں اوّل رہتے تھے۔ اور مضمون نویسی پر متعدد انعامات حاصل کئے جن کا تذکرہ قدیم دہلی کالج کی رپورٹوں میں موجود ہے۔

غدر میں مولوی محمد باقر صاحب دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں شہید ہوئے تو آزاد پریشان ہو کر دہلی سے نکلے اور ایک عرصہ تک صحرا نوردی کے بعد جگراؤں (پنجاب) اور ریاست جیند ہوتے ہوئے

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد

لاہور پہنچے۔ جہاں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات کے دفتر میں ملازم ہو گئے کچھ عرصے کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات نے انھیں سرکاری اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کر دیا۔

۱۸۶۷ء میں آزاد حکومتِ ہند کے ایما سے وسطِ ایشیا میں رُوسی ریشہ دوانیاں اور وہاں کے سیاسی حالات معلوم کرنے کے لئے کابل اور بدخشاں وغیرہ گئے۔ وہاں سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۸۸۳ء میں ایران کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی پر معلومات کے ذخیرے کے علاوہ کتابوں کا ایک گراں بہا انبار اپنے ہمراہ لائے اور لاہور میں آکر مشرقی زبانوں کی ایک لائبریری "کتب خانۂ آزاد" کے نام سے قایم کی۔

۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جُبلی کے موقع پر آزاد کو علمی خدمات کے صلے میں سرکار انگریزی نے شمس العلماء کے خطاب سے ممتاز کیا۔

۱۸۶۸ء میں آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی مدد سے لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جس میں مصرعہ طرح کی بجائے چند موضوعات مثلاً زمستاں۔ رحم۔ انصاف۔ برسات وغیرہ پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ گویا موجودہ نیچرل شاعری کے اولین علمبردار آزاد ہیں۔ جن کی کوششوں سے آج اُردو شاعری کا دامن گلہائے مراد سے مالا مال نظر آتا ہے

نثر میں آزاد کی دو قسم کی کتابیں ہیں۔ ایک وہ جو اُنھوں نے

سررشتۂ تعلیم کے لئے لکھیں۔ جیسے اُردو کی پہلی اور دوسری کتاب قصص ہند حصّہ دوم۔ دوسرے ادبی کتابیں جن میں آبحیات۔ نیرنگ خیال۔ دربار اکبری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

آزاد کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی فقرہ بدل کر دوسرے انداز سے لکھ دیا جائے تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ وہ اُردو زبان کے نبض شناس تھے اور جانتے تھے کہ کس مقام پر کونسا لفظ تمام جملہ میں جان ڈال دیتا ہے۔ آزاد کے بیان کی سلاست۔ زبان کی فصاحت۔ الفاظ کی گھلاوٹ اور موقع بموقع ظرافت کی چاشنی انھیں دوسرے انشا پردازوں سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ جن کا تتبع ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔ ایک اور حکیم اس لطیفہ کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔ میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا۔ اور بے فکری کے تکیئے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک[1] کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے رنج والم اور مصائب[2] و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے

---

[1] آسمانوں کا بادشاہ یعنی خدا۔ [2] مصیبتیں۔

بھی اونچا ہو گیا۔ ایک شخص سوکھا سہما دُبلا پے کے مارے فقط ہوا کی حالت
ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اُسکے
ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بُری معلوم
ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن
دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جناتوں کی
تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں۔ اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں
تو ہزاروں عجیب غریب صورتیں اُسپر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ
تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اُسکا وہم تھا۔ وہ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا
تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں[1]
اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں
کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں
ہو سکتا۔ اُس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اُن سے
ذرا میرا دل بہلا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک
شخص پُرانے سے چکن کے چُغے میں ایک بھاری سی گٹھری لئے آتا ہے
جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس[2] کا عذاب تھا۔ اس کے
پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے
بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا
کہ اس کی جورو بہت بُری تھی اُس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔ ان کے

[1] انسانوں۔ [2] غریبی۔

بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ اِن کے سروں پر دُود آہ[1] کی گٹھریاں تھیں۔ کہ اُنہیں میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ و بالی دبے ہوئے تھے اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اِس درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے اُن کے پھٹ جائیں گے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اِس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ اِن بوجھوں کو سر سے پھینکدیں کچھ کچھ جد و جہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اُسی طرح چلے گئے۔

بہت بڑھیاں دیکھیں۔ جو بدن کی جھُریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اُس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔

ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ کُبڑا ہے اور آدم زاد[2] کے انبار رنج والم میں اپنے کُبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اِس انبار میں انواع و اقسام کے سقم[3] اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمو

[1] آہوں کا دھواں [2] آدمیوں۔ [3] بیماریاں۔

خواہ مخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا.......Persian.......

...........مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوسہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی، اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئیگا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اُس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی۔ مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے۔ جب تمام بنی آدم اپنے اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اُتار چکے تو میاں وہم۔ کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ اُن کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اُڑ گئے۔ مگر اُنہوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا مُنہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا

نظر آیا کہ جی بیزار ہوگیا۔ اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اُتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اُتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہانتک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کی برابر تھی۔ ہم اِس انبوہ پُر آفات[1] پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اِس عالم ہیولائی[2] کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے۔ جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کرلیں۔ اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سُنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور بڑی ٹُرت پھُرت کے ساتھ اِس انبار عظیم کے بوجھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اسوقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔ ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا۔ درد قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک[3] کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اُس نے درد ند کو ر پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دِق ہو کر اِس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اِس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بُڈھے کی

[1] مصیبتوں سے بھرا ہوا۔ [2] خیالی۔ [3] جائداد۔

ڈاڑھی پکڑلی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا۔ کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا چنانچہ بڈھے نے اُس سے کہا کہ براہِ خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لے لیجئے۔ کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے مگر مشکل یہ ہوئی کہ مبادلہ[1] اب پھر نہ سکتا تھا۔ ایک بیچارہ جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اُس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھوڑ لے کے عرض کو لے لیا تھا۔ اُسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے بسور رہا ہے۔ غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے کئے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لی تھی وہ اُس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی۔ وہ اب جوع البقر[2] کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اُسے چھوڑا تھا۔ اب وہ درد جگر کا مارا لوٹ رہا تھا۔ اور اسی طرح بر عکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی حاصل ہوتی تھی۔ عورتیں بے چاری اپنے اول بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی۔ اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی۔ مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دُبلے تھے اس لئے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ

---

[1] تبدیلی۔ [2] ایک بیماری جس میں بیحد بھوک لگتی ہے

بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو، ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہار کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے مجھے اُس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت جوان بن کر چلا۔ مگر مثانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا۔ کہ بے چارہ لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی۔ گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوئے[1] سر سے اونچے نکل آئے تھے۔ اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں۔ ان کا غول گرد تھا۔ یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کئے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لیکر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے۔ کہ جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرا تھا مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر

[1] شانے۔ لندھے

مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے
عرق ندامت[1] پوچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرا اتنا بڑا ہو گیا تھا
کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی تھی کہ جب چہرے
پر ہاتھ پھرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو
آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر[2] کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ
شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا
اُس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی
نہ ہوتی تھی۔ اِن دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم
ہوتا تھا، گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے۔ سر کا یہ عالم تھا۔ گویا ہوا میں اُڑا جاتا
ہے۔ اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے
قدم اُٹھاتا تھا اگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھینچے چلے جاتے
تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت[3] کی حالتِ غریب کو دیکھ کر کہا۔ کہ میاں
اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے
ہیں۔ غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا مگر لوگوں
کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے
اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے
تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری نالہ و فریاد آہ و افسوس سے دھواں
دھار ہو رہا تھا آخر سلطان الافلاک کو بے کس آدم زاد کے حال

[1] شرمندگی کا پسینہ۔ [2] ہنسنا۔ [3] عجیب انسان۔

دردناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دو۔ پہلے ہی بوجھ انہیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اِن وبالوں کو سر و گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ شیطانِ نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اِس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اسکی حرکات و سکنات نہایت معقول اور باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھایا اور رحمتِ الہٰی پر توکل[1] کر کے نگاہ کو اُسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اِس کوہِ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کوہِ مذکور خود بخود گھٹنا شروع ہوا۔ یہانتک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث[2] رہگیا پھر اُس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا۔ اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بُردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اِسکا شکریہ کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اِس انبارِ لا انتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چھَنٹنا نہ پڑا۔

(از نیرنگِ خیال حصہ اول)

---

[1] بھروسہ۔ [2] تہائی۔

اکبر کی شجاعتِ ذاتی اور بیجد دلاوری

یہ بات راجگان ہند کے اصول سلطنت میں داخل تھی کہ راج کا فرمانروا اکثر خطرناک اور جان جوکھوں کے کام کر کے خاص و عام کے دلوں میں ایک تاثیر پھیلائے۔ جس سے وہ سمجھیں کہ بے شک تائید[1] غیبی اس کے ساتھ ہے اور اقبال[2] اس طرح مددگار ہے کہ ہم میں سے یہ بات کسی کو نصیب نہیں اور اسی واسطے اس کی عظمت خدا کی عظمت اور اس کی اطاعت اطاعتِ الٰہی کی پہلی سیڑھی ہے اور یہی بات ہے کہ ہندو راجہ کو بھگوان کا اوتار۔ اور مسلمان ظل اللہ (سایۂ خدا) کہتے ہیں اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا۔ تیموری و چنگیزی لہو کی گرمی سے ہمت۔ جرأت۔ جذبہ و جوش اور شوق ملک گیری جو اس کے لہو میں باقی تھا۔ وہ خیالات کو اور بھی گرماتا رہتا تھا۔ بلکہ یہ جوش یا بابر کی طبیعت میں تھا یا اس میں۔ کہ جب دریا کے کنارے پر پہنچتا تھا خواہ مخواہ گھوڑا پانی میں ڈال دیتا تھا۔ جب وہ اس طرح دریا اُترے تو نمک حلالوں میں کون ہے کہ جان نثاری کا دعویٰ رکھے اور اس سے آگے نہ ہو جائے ہمایوں راحت پسند تھا کہیں ایسا ہی بوجھ پڑا ہے۔ جب وہ اس طرح جان پر کھیلا ہے۔ یلغار کر کے مہمیں کرنی ہمت کے گھوڑے پر چڑھ کر

---

[1] خدا کی مدد۔ [2] نصیبہ۔

آپ تلوار مارنی قلعوں کے محاصرے کرنے۔ سرنگیں لگانی۔ ادنیٰ سپاہیوں کی طرح مورچے مورچے پر آپ پھرنا اکبر ہی کا کام تھا۔ اس کے بعد جو ہوئے وہ عیش و آرام کے بندے تھے۔ بندگانِ خدا سے عبادت وصول کرنے والے۔ دربار بادشاہی کے رکھوالے اور پیٹ کے ماروں کے سر کٹوانے والے بنئے مہاجن تھے۔ کہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ یا پیرزادے کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں اور آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اکبر جب تک کابل میں تھا تو اونٹ سے بڑا کوئی جانور نظر نہ آتا تھا اس لئے اسی پر چڑھتا تھا دوڑاتا تھا۔ لڑاتا تھا۔ کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا اور نشانے لگاتا تھا۔ باز باشے[1] اڑاتا تھا۔

جب ہمایوں ایران سے ہندوستان کو پھرا اور کابل میں آکر آرام سے بیٹھا تو اکبر کی عمر پانچ برس سے کچھ زیادہ ہوگی۔ یہ بھی چچا کی قید سے چھٹا۔ سیر و شکار جو شہزادوں کے شغل ہیں۔ ان میں دل خوش کرنے لگا ایک دن کُتے لے کر شکار کو گیا۔ کوہستان کا ملک ہے۔ ایک پہاڑ میں ہرن خرگوش وغیرہ شکار کے جانور بہت تھے۔ چاروں طرف نوکروں کو جما دیا کہ رستے روکے کھڑے رہو کوئی جانور نکلنے نہ پائے اسے لڑکا سمجھ کر نوکروں نے بے پرواہی کی۔ ایک طرف سے جانور نکل گئے۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ جن نوکروں نے غفلت کی تھی انھیں رسوائی

---

[1] ایک شکاری پرندہ۔

کے سبب تمام اُردو[1] میں تشہیر[2] کیا۔ ہمایوں سُن کر خوش ہوا اور کہا۔ شکر خدا کہ ابھی سے اس نونہال کی طبیعت میں سیاست[3] شاہانہ اور ایجاد آئین[4] کے اصول ہیں۔ Persian

جب ۹۶۲ھ ہجری میں ہمایوں نے اکبر کو صوبہ پنجاب کا انتظام سپرد کر کے دلّی سے روانہ کیا تو سرہند کے مقام میں حصار فیروزہ کی فوج آکر شامل ہوئی۔ ان میں اُستاد عزیز سیستانی بھی تھا۔ اسے توپ اور بندوق کے کام میں کمال تھا۔ اور بادشاہ سے رومی خاں کا خطاب حاصل کیا تھا اور وہ بھی اکبر کے سلام کو آیا۔ اپنی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی[5] کے کمال اس خوبی سے دکھلائے کہ اکبر کو بھی شوق ہوگیا۔ شکار کا عشق تو پہلے ہی تھا۔ یہ اُسکا جزو اعظم ہوا۔ چند روز میں ایسا مشاق[6] ہوگیا کہ بڑے بڑے گُل چلے اُستاد کان[7] پکڑنے لگے۔

جس طرح ہندوستان میں چیتوں سے شکار کھیلتے ہیں۔ ایران اور ترکستان میں اسکا رواج نہیں۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر آیا۔ اکبر ساتھ تھا۔ بارہ برس کی عمر تھی۔ سرہند کے مقام پر سکندر خاں افغان انبوہ در انبوہ افغانوں کی فوج کو لئے پڑا تھا۔ جنگ عظیم ہوئی اور ہزاروں کا کھیت پڑا۔ افغان بھاگ گئے۔ خزانے ہزار در ہزار اور اموال بے شمار فوج بادشاہی کے ہاتھ آئے۔ ولی بیگ ذوالقدر (بیرم خاں کا بہنوئی۔ حسین قلی خاں خان جہاں کا باپ) سکندر کے چیتا خانے میں سے

[1] لشکر۔ [2] پھرایا۔ [3] سزا دینا [4] قانون بنانا۔ [5] بندوق کا نشانہ۔ [6] ماہر۔ [7] ہار مانتے تھے۔

ایک چیتا لایا۔ اس کا نام فتح باز تھا۔ دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہنر اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر عاشق ہوگیا اور اُسی دن سے چیتوں کا شوق ہوگیا۔ سینکڑوں چیتے جمع کئے۔ ایسے سدھے ہوئے تھے کہ اشاروں پر کام دیتے تھے اور دیکھنے والے حیران رہتے تھے۔ کمخواب اور مخمل کی جھولیں اوڑھے گلے میں سونے کی زنجیریں آنکھوں پر زردوزی چشمے چڑھے۔ بہلیوں میں سوار چلتے تھے بیلوں کا سنگھار بھی اُن سے کچھ کم نہ تھا۔ سنہری روپہلی سنگوٹیاں چڑھی۔ زردوزی تاج سر پر۔ زریں اور زرتاج جھولیں۔ جھم جھم کرتی۔ غرض کہ عجب بہار کا عالم تھا۔ ایک دفعہ سفر پنجاب میں چلے جاتے تھے۔ کہ ایک ہرن نمود آ ہوا۔ حکم ہوا کہ اس پر چیتا چھوڑو۔ چھوڑا۔ ہرن بھاگا۔ ایک گڑھا بیچ میں آگیا۔ ہرن نے چاروں ٹیلیاں جھاڑ کر جست کی اور صاف اُڑ گیا۔ اور چیتا بھی ساتھ ہی اُڑا اور ہوا میں آدبوچا۔ جیسے کبوتر اور شہباز۔ عجب طرح سے اوپر تلے گتھم گتھا ہوتے ہوئے گر رہے۔ سواری کا انبوہ تھا۔ دلوں سے واہ واہ کا ولولہ نکلا۔ عمدہ عمدہ چیتے آتے تھے۔ اُن میں سے انتخاب ہوتے تھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خاصے میں داخل ہوتے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اُن کی تعداد کبھی ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہتی۔ کچھ نہ کچھ عارضہ ایسا ہوتا تھا۔ کہ چند چیتے مرجاتے تھے۔ سب حیران تھے۔ اور اکبر بھی متعجب رہتا تھا۔

ہاتھی

ہاتھی کا بڑا شوق تھا۔ اور یہ شوق فقط شاہوں اور شہزادوں کا شوق نہ تھا۔ ہاتھیوں کے سبب اکثر مہمیں قایم ہوگئیں جن میں لاکھوں، کروڑوں روپے صرف ہوئے اور ہزاروں سر کٹ گئے۔

خود ہاتھی پر بہت خوب بیٹھتا تھا۔ سر شور مست۔ آدم کش ہاتھی۔ کہ بڑے بڑے مہاوت ان کے پاس جاتے ہوئے ڈریں وہ بے لاگ جاتا۔ برابر گیا۔ کبھی دانت کبھی کان پکڑا اور گردن پر نظر آیا۔ ہاتھی سے ہاتھی پر اُچھل جاتا تھا۔ اور اس کی گردن پر بیٹھ کر بے تکلف ہنستا کھیلتا۔ لڑاتا بھگاتا۔ گدی جھول کچھ نہیں۔ فقط کلاوے[1] میں پاؤں ہے اور گردن پر چڑھا ہوا ہے۔ کبھی درخت پر بیٹھ جاتا۔ جب ہاتھی برابر آیا جھٹ اُچھلا اور گردن یا پُشت پر۔ پھر وہ بہتیری جھرجھریاں لیتا۔ سر دھنتا ہے۔ کان پھٹ پھٹاتا ہے یہ کب ہلتے ہیں۔

ایک دفعہ اس کا پیارا ہاتھی مستی کے عالم میں چھُٹا اور فیلخانے سے نکل کر بازاروں میں ہتیائی[2] کرنے لگا۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ اکبر سُنتے ہی قلعہ سے نکلا اور پتہ لیتا ہوا چلا۔ کہ کدھر ہے۔ ایک بازار میں پہنچکر غل سُنا کہ وہ سامنے سے آتا ہے۔ اور خلقت خدا کی بھاگی چلی آتی ہے

---

[1] وہ سوت کی ڈوری جو ہاتھی کے گلے میں باندھتے ہیں۔ اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ بنا لیتے ہیں اس میں پاؤں رکھ کر پاؤں کے انگوٹھے سے ہاتھی کے کان کی جڑ کو چھیڑتے ہیں۔ اسی اشارے سے ہاتھی چلتا ہے۔ [2] مستی۔

یہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک کوٹھے پر چڑھ گیا اور اس کے چھجے پر آ کھڑا ہوا جونہی ہاتھی برابر آیا جھٹ لپک کر اس کی گردن پر۔ دیکھنے والے بے اختیار چلائے۔ ہا ہا ہا! پھر کیا تھا۔ دیو قابو میں آ گیا۔ یہ باتیں چودہ پندرہ برس کی عمر کی ہیں۔

لکھنہ ہاتھی بدمستی اور بدخوئی میں بدنام عالم تھا۔ ایک دن (دہلی میں) اس پر سوار ہوا اور ایک جنگجو خونریز اسی کی جوڑ کا ہاتھی منگا کر میدان میں لڑانے لگا۔ لکھنہ نے بھگا دیا اور بھاگتے کے پیچھے دوڑا۔ ایک تو مست دوسرے فتحیابی کا جوش۔ لکھنہ اپنے حریف کے پیچھے دوڑا جاتا تھا۔ ایک تنگ اور گہرے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ پاؤں بھی ایک ستون کا ستون تھا۔ مستی کی جھونجل[1] میں پھر پھر کر جو حملے کئے تو بھبنیہ بھی بیٹھے[2] پر سے گر پڑا۔ اکبر اول سنبھلا۔ اخیر کو اس کے آسن بھی گردن سے اُکھڑے مگر پاؤں کلاوے میں اٹکا رہ گیا۔ جاں نثار نمک حلال گھبرا گئے اور عجب غلغلہ پڑ گیا۔ یہ اس پر سے اُترے اور جب ہاتھی نے اپنا پاؤں باہر نکال لیا تو پھر اُسی پر سوار ہو کر ہنستے کھیلتے چلے گئے، وہ زمانہ ہی اور تھا۔ خانخاناں زندہ تھے۔ انہوں نے صدقے اُتارے۔ روپے اشرفیاں نثار کیں۔ اور خدا جانے کیا کیا کچھ کیا۔

خاصہ کے ہاتھیوں میں ایک ہاتھی کا ہوائی نام تھا۔ کہ بدہوائی اور شرارت میں باروت کا ڈھیر تھا۔ ایک موقع پر کہ وہ مست ہو رہا تھا۔

[1] جوش۔ [2] کمر۔

میدان چوگان[1] بازی میں اُسے منگایا۔ آپ سوار ہوئے۔ اِدھر اُدھر دوڑاتے پھرے۔ بٹھایا۔ اٹھایا۔ سلام کروایا۔

رن باگھ ایک اور ہاتی تھا۔ اُس کی بدستی اور سرشوری کا بھی بڑا غُل تھا۔ اُسے بھی وہیں طلب فرمایا اور آپ ہوائی کو لے کر سامنے ہوئے ہواخواہوں کے دل بیقرار ہوگئے۔ جب دونوں دیو ٹکر مارتے تھے پہاڑ ٹکراتے تھے۔ اور دریا جھکولے کھاتے تھے۔ آپ شیر کی طرح اوپر بیٹھے تھے۔ کبھی سر پر تھے اور کبھی پُشت پر۔ جاں نثاروں میں کوئی بول نہ سکتا تھا۔ آخر آتکہ خاں کو بلا کر لائے کہ سب کا بزرگ تھا۔ بُڈھا بچارہ ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ داد خواہوں کی طرح سر ننگا کر لیا۔ پاس گیا اور مظلوم فریادیوں کی طرح دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخیں مارنے لگا۔ "شاہم[2] برائے خدا ببخشید۔ للہ بر حال مردم رحم آرید۔ بادشاہم! جان بندگان مے رُود"۔ چاروں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ اکبر کی نظر آتکہ خان پر پڑی اسی عالم میں آواز دی: "چرا[3] بے قراری مے کنید۔ اگر شما آرام نہ نشینید ما خود را از پشتِ فیل می اندازیم"۔ وہ محبت کا مارا ہٹ گیا۔ آخر رن باگھ بھاگا اور ہوائی آگ بگولا ہو کر پیچھے پڑا۔ دونوں ہاتھی آگا دیکھتے تھے نہ پیچھا۔ گڑھا نہ ٹیلا۔ جو سامنے آتا لانگھتے پھلانگتے چلے جاتے تھے۔ جمنا کا پُل سامنے آیا اس کی بھی پروا

---

[1] پولو۔ [2] میرے بادشاہ خدا کے لئے بخش دیجئے۔ خدا کے واسطے لوگوں کی حالت پر ترس کھائیے میرے بادشاہ غلاموں کی جان جاتی ہے۔ [3] آپ اتنے بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو۔ اگر تم صبر سے نہیں بیٹھو گے تو میں اپنے آپ کو ہاتھی سے گرا دونگا۔

نہ کی۔ دو پہاڑوں کا بوجھ! کشتیاں دبتی تھیں۔ خلقت کناروں پر جمع تھی اور دونوں کا عجب عالم تھا۔ جاں نثار دریا میں کود پڑے۔ پُل کے دونوں طرف تیرتے چلے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے ہاتھی پار ہوئے۔ بارے رن باگھ ذرا تھما۔ ہوائی کے زور و شور بھی ڈھیلے پڑے۔ اسوقت سب کے دل ٹھکانے ہوئے۔ جہانگیر نے اِس سرگذشت کو اپنی توزک[1] میں درج کر کے اتنا زیادہ لکھا ہے۔ میرے والد نے مجھ سے خود فرمایا کہ ایک دن ہوائی پر سوار ہو کر میں نے ایسی حالت بنائی گویا نشے میں ہوں۔ پھر بھی سارا ماجرا تحریر کیا اور اکبر کی زبانی یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر میں چاہتا تو ہوائی کو ذرا سے اشارے میں روک لیتا۔ مگر اول سرخوشی[2] کا عالم ظاہر کر چکا تھا۔ اِس لئے پُل پر آکر سنبھلنا مناسب نہ سمجھا کہ لوگ کہیں گے بناوٹ تھی۔ یا یہ سمجھیں گے کہ سرخوشی تو تھی مگر پُل اور دریا دیکھ کر نشے ہرن[3] ہو گئے اور ایسی باتیں بادشاہوں کے باب میں نازیبا ہیں۔"

اکثر شیر ببر شکار گاہوں یا عالم سفر میں اس کے سامنے آئے اور اس نے تنہا مارے۔ کبھی تیر، کبھی تفنگ۔ کبھی تلوار سے۔ بلکہ اکثر آواز دی ہے کہ خبردار کوئی اور آگے نہ بڑھے۔

ایک دن فوج کی موجودات[4] لے رہا تھا۔ دو راجپوت نوکری کے لئے سامنے آئے۔ اکبر کی زبان سے نکلا۔ کچھ بہادری دکھاؤ گے؟

---

[1] جہانگیر نے اپنے حالات خود لکھے ہیں۔ کتاب کا نام توزک جہانگیری ہے۔ [2] مستی [3] نشہ بھاگ گیا [4] حاضری۔

اُن میں سے ایک نے اپنی برچھی کی بوری اُتار کر پھینک دی اور دوسرے کی بھال اُس پر چڑھائی۔ تلواریں سونت لیں۔ برچھیوں کی انیاں سینوں پر لیں اور گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں۔ بے خبر گھوڑے جھپک کر آگے بڑھے۔ دونوں بہادر چھد کر بیچ میں آن ملے۔ اِس نے اُس کے تلوے کا ہاتھ مارا۔ اُس نے اِس کے۔ دونوں وہیں کٹ کر ڈھیر ہو گئے اور دیکھنے والے حیران رَہ گئے۔ اکبر کو بھی جوش آیا۔ مگر کسی کو اپنے سامنے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حکم دیا کہ تلوار کا قبضہ دیوار میں خوب مضبوط گاڑ دو پھل باہر نکلا رہے۔ پھر تلوار کی نوک پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے کو حملہ کرے۔ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر بڑے جھنجلائے۔ اُس کو اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ کہ جوش خدا داد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ انگوٹھے کی گھائی میں زخم بھی آ گیا تھا۔ مظفر سلطان نے زخمی ہاتھ مروڑ کر مان سنگھ کو چھڑایا۔ اِس کشتم کشتا میں زخم زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر علاج سے جلد اچھا ہو گیا

انھیں دنوں میں کسی خلاف طبع بات پر غصہ ہو کر سواری کو گھوڑا مانگا اور حکم دیا کہ سائیس خدمت گار کوئی ساتھ نہ رہے۔ خاصہ کے گھوڑوں میں ایک سُرنگ[1] گھوڑا تھا۔ ایرانی۔ کہ خضر خواجہ خاں نے پیش کیا تھا (خالو تھے) گھوڑا نہایت خوبصورت اور خوش ادا جیسا اُن اوصاف میں بے نظیر تھا ویسا ہی سرکش، سر شور اور شریر تھا۔ چھوٹ جاتا تھا تو کسی کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ کوئی چابک سوار اس پر سواری کی

[1] وہ گھوڑا جس کی ایال اور دُم کے بال سُرخ ہوں۔

جرأت نہ کرسکتا تھا۔ بادشاہ خود ہی اس پر سوار ہوتے تھے۔ اس دن غصّے میں بھرے ہوئے تھے۔ اُسی پر سوار ہو کر نکل گئے رستے میں خدا جانے کیا خیال آیا کہ اُتر پڑے اور درگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ گھوڑا اپنی عادت کے بموجب بھاگا اور خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ اپنے عالم میں غرق۔ اسکا خیال بھی نہیں جب حالت سے ہوش میں آئے تو دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہاں۔ نہ کوئی اہلِ خدمت پاس نہ گھوڑا ساتھ۔ کھڑے سوچ رہے تھے اتنے میں دیکھتے ہیں۔ وہی وفادار گھوڑا سامنے سے چلا آتا ہے پاس آیا اور سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کوئی کہتا ہے۔ کہ خانہ زاد[1] حاضر ہے، سوار ہو جائیے۔ اکبر بھی حیران رہگیا اور سوار ہو کر لشکر میں آیا۔

اگرچہ بادشاہوں کو ہر ملک میں ہر وقت میں جان کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مگر ایشیائی ملکوں میں جہاں شخصی سلطنت کا سِکّہ چلتا ہے۔ وہاں زیادہ خطر ہوتا ہے۔ خصوصاً اگلے وقتوں میں کہ نہ سلطنت کا کوئی اصول یا قانون تھا نہ لوگوں کے خیالات کا کوئی قاعدہ باوجود اس کے اکبر کسی بات کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُسے ملک کے حال سے باخبر رہنے اور لوگوں کو آرام و آسائش سے رکھنے کا بڑا خیال تھا۔ ہمیشہ اسی فکر میں لگا رہتا تھا۔

---

[1] غلام۔

ابوالفضل سے خود ایک دن بیان کیا کہ ایک رات آگرے کے باہر چھپڑیوں کا میلہ تھا۔ میں بھیس بدل کر وہاں گیا۔ کہ دیکھوں لوگ کس حال میں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ایک بازاری سا آدمی تھا۔ اس نے مجھے پہچان کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ دیکھنا بادشاہ جاتا ہے۔ وہ برابر ہی تھا۔ میں نے بھی سُن لیا۔ جھٹ آنکھ کو بھینگا کر کے مُنہ ٹیڑھا کر لیا اور اُسی طرح بے پرواہی سے چلا گیا۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر دیکھا اور غور کر کے کہا۔ وہ نہیں۔ بھلا اکبر بادشاہ کہاں۔ اس کی وہ صورت کہاں۔ یہ تو کوئی بڑھا موا ہے اور بھینگا بھی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس بھیڑ سے نکلا اور اپنے تکلف کو برطرف کر کے قلعہ کی راہ لی۔

اکبر نے اپنے غنیموں پر بڑے زور شور کی ملیغاریں اور جان جوکھوں کے ساتھ دھاوے کئے اور تھوڑی جمعیت سے ہزاروں کے لشکر گرد[1] باد کر دئیے لیکن ایک دھاوا اُس نے ایسے موقعہ پر کیا۔ جس کا اس سلسلے میں لکھنا بھی ناموزوں نہیں ہے۔ موٹہ راجہ کی بیٹی راجہ جے مل سے بیاہی تھی۔ وہ جاں نثار اکبر کا مزاج[2] شناس تھا۔ ۹۹۱ھ ہجری میں کسی کار ضروری کے لئے اسے بنگالے بھیجا تھا۔ حکم کا بندہ گھوڑے کی ڈاک پر بیٹھ کر دوڑا۔ تقدیر کی بات کہ جوسا کے گھاٹ پر تھکن نے بٹھا دیا اور تھوڑی دیر میں لٹا کر بستر مرگ پر سُلا دیا۔

بادشاہ کو خبر ہوئی۔ سُن کر بہت افسوس ہوا۔ محل میں آئے تو معلوم

---

[1] بھگا دئیے۔ [2] مزاج اور طبیعت سے واقف۔

ہوا اس کا بیٹا اور چند اور جاہل راجپوت اپنی جہالت کے زور سے رانی کو زبردستی ستی کرتے ہیں۔

خدا ترس بادشاہ کو ترس آیا اور تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھا کہ ممکن ہے کسی اور امیر کو بھیج دوں۔ مگر اُس کے سینے میں اپنا دل اور دل میں یہ درد کیونکر ڈال دوں۔ فوراً گھوڑے پر بیٹھا اور ہوا کے پر لگا کر اڑا۔ اکبر بادشاہ کا دفعتاً تخت گاہ سے غائب ہو جانا آسان بات نہ تھی۔ شہر میں شور اور عالم میں شورش مچ گئی۔ جا بجا ہتھیار بندی ہونے لگی۔ اس دوڑا دوڑ میں اُمرا اور اہلِ خدمت میں سے کون ساتھ نبھا سکے۔ چند جان نثار اور کئی خدمتگار رکاب میں رہے اور دفعتاً محلِ واردات[1] پر جا کر کھڑے ہوئے اکبر کو شہر کے قریب کسی جگہ ٹھہرایا۔ راجہ جگناتھ اور راجہ رائے سال گھوڑے مار کر آگے بڑھ گئے تھے اُنہوں نے جا کر خبر دی کہ مہابلی آگئے۔ فدی جاہلوں کو روکا اور حضور میں لاکر حاضر کر دیا۔

بادشاہ نے دیکھا کہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں اس لئے جان بخشی کی لیکن حکم دیا کہ چند روز ادب[2] خانۂ زندان میں رہیں۔ رانی کی جان کے ساتھ ان کی بھی جان بچ گئی۔ اُس دن وہاں سے پھر جب فتحپور میں پہنچا تو سب کے دم میں دم آیا۔

(از دربارِ اکبری)

---

[1] وہ جگہ کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ [2] قید خانہ۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں

۹۶۴ھ ہجری میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیمو کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمہ بلبل کے سُروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوشخبری نیک شگون معلوم ہوئی اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لٹائے اور اپنے بیگانوں کو انعام واکرام سے مالامال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو۔ کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ خانو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک مولود[1] کی ولادت خاص شہر لاہور میں ہوئی۔

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتاً خزاں کی نحوست ایسی بگولہ بن کر لپٹی۔ کہ اس کے گلبن[2] کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اور گھانس پھونس کی طرح مدت تک رواں[3] دواں کرتی رہی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کے دیکھنے والے ترس کھاتے

---

[1] بچہ جو پیدا ہوا۔ [2] گلاب کا پودا۔ [3] اُڑاتی رہی۔

ہیں۔ وائے برحال اُس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے۔ جب اس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہونگے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں جب اِسقدر اونچے پہنچتے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں۔ یہ تارا کہاں سے نکل آیا؟

خدا تر نوالہ دے۔ خواہ سوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے مُنہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آن کر دہلی میں آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرے رہ گئے یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لئے وکیل پہنچتا ہے تو قید۔ دربار کے طور بے طور۔ خبر آتی ہے تو وحشتناک۔ بچہ معصوم اِن رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا۔ مگر اتنا تو ضرور دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں، وہ امراء اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی۔ باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا نہیں۔

بیرم خاں بیچارہ کیا کرے۔ کبھی بنگالے کا ارادہ کرتا ہے۔ کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے۔ اِدھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رُخ کرتا ہے۔ چند روز اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کچّا ساتھ[1]

[1] بچوں اور عورتوں کا ساتھ۔

اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ۔ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بھنڈے میں چھوڑا اور آپ پنجاب میں آیا۔ بھنڈہ کا حاکم اپنا نمک پروردہ۔ خاک سے اٹھایا ہوا۔ ہاتھوں کا پالا ہوا چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت تک پہنچایا ہوا۔ اُس نے مال و عیال کو ضبط کر کے روانہ دربار کر دیا۔ دہلی میں آ کر سب قید۔ اسباب خزانے میں داخل۔ وہ تین چار برس کا بچہ۔ روز کی پریشانی اور بے سروسامانی اور گھر والوں کی سرگردانی۔ روز نئے شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران رہتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں۔ میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں[1] میں کیوں فرق آ گیا۔؟ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہو گئے؟

اور اِس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں۔ ابھی سورج جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خان خاناں آتا ہے۔ خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا۔ اُس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم[2] مچ گیا۔ پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھری لئے جاتا ہے۔ کوئی صندوقچہ کسی نے مسند گھسیٹ لی۔ کوئی بچھونا لیچلا یہانتک کہ اُس بےکس مُردے کے کپڑے تک اُتار لئے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے؟ کہ اپنی اپنی جان کا ہوش نہیں۔ وہ تین

---

[1] محبت کرنا۔ [2] کھلبلی۔ ہل چل۔

برس کی جان کیا کرتا ہوگا؟ سہم کر رہجاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا ڈرتا ہوگا۔ اناؔ کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بے چاریاں کہاں چھپالیں۔ کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا شام غریباں اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی۔ دن ہوا تو روزِ محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے تھے اسوقت کچھ بن نہ آتی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے کہ لُٹے قافلے کو سمیٹتا ہے اور احمد آباد اُڑے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔

اسوقت اُن پاشکستہ[1] عورتوں کو جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے۔ لے نکلنا غنیمت ہے۔ لُٹیرے اب بھی دستبردار نہیں ہوئے۔ پیچھے پیچھے لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور رہجاتا ہے۔ کون دلاسا دے۔ اور ڈرے تو کیا ہوتا ہے۔ الٰہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب کیجیو۔

اُن مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جا کر دم لیا۔ کئی دن میں گئے ہوئے حواس ٹھکانے آئے۔ صلاح ہوئی کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہئیے۔ چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہنچا کر پھر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دریادلی اور اکبری عفو[2] وکرم کے دریا میں لہر آئی۔ ان کے لئے فرمان بھیجا۔ خانخاناں

---

[1] مصیبت زدہ۔ [2] معاف کرنا۔

کے مرنے کا رنج والم اور ان کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ عبدالرحیم کو تسلی دینا اور بڑی خبرداری اور ہوشیاری سے لیکر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ انھیں جالور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا۔ ہمت بندھ گئی اور حضور میں پہنچے۔

اس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہو گا جبکہ بابا زنبور سب تباہی زدوں کو لے کر آگرے میں پہنچے ہونگے عورتوں کو محل میں اُتارا ہو گا۔ اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لاکر چھوڑ دیا ہو گا۔ اندر شکستہ پا عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ۔ باہر اس کے قدیمی نمکخوار دعائیں کرتے ہونگے کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیں۔ الٰہی سارا دربار دشمنوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس بن باپ کے بچے کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آئندہ کی بہبودی کا سہارا کون ہے۔ اگر ہے تو اسی بچے کی جان ہے تو ہی اسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائیگا۔

چغتائی سلسلے میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملے میں قابل تعریف ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا تو آنکھ جھپک جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے۔ خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا اور پھر بھی بیرم کا بیٹا۔ جس وقت سامنے لائے ہیں اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گود میں اٹھا لیا۔ اُس کے نوکروں کے لئے تنخواہیں

اور بیش[1] قرار وظیفے مقرر کئے اور کہا۔ کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا[2] کا ذکر نہ کیا کرو۔ بچہ ہے دل کڑھے[3] گا۔ بابا زنبور نے رو کر کہا۔ کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک اُٹھتے ہیں کہ کہاں گئے۔ اب تک کیوں نہیں آئے؟ اکبر نے کہا کہ کہدیا کرو کہ حج کو گئے ہیں۔ خانۂ خدا میں پہنچ گئے۔ بچہ ہے باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو۔ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ بابا زنبور یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو۔

۹۶۹ھ میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکان دولت تھے۔ وہ یا اُن کے خوشامدی ہر وقت حضور میں حاضر رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے جن سے بیرم کی پچھلی باتیں اکبر کو یاد آجائیں اور وہ اس کی طرف سے کھٹک جائے اکثر ان میں سے کُھلم کُھلا سمجھاتے لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا۔ کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں ان باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اُسے مرزا خان کہا کرتا تھا۔ کہ ابتدائی ذکر میں اُسے اہل تاریخ مرزا خان ہی لکھتے ہیں۔

ہونہار لڑکا اکبری سائے میں پرورش پانے لگا اور بڑا ہو کر ایسا نکلا کہ مورخ اس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں۔ بلکہ علمیت سے زیادہ تیزیِ فکر اور قوتِ حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی کیفیت

[1] بہت زیادہ [2] اکبر بیرم خاں کو خان بابا کہتا تھا۔ [3] دل کو رنج ہوگا۔

اور اثنائے تحصیل اور حدِ تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا۔ کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو علماء کا قدردان تھا۔ اہلِ تصنیف اور شعراء کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا۔ اور بے تکلف بولتا تھا۔ زبان ترکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث تھی اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ بلبل ہزار داستاں تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فنِ جنگ میں اعلیٰ درجے کی لیاقت رکھتا تھا۔

اس کے باپ کے چند وفادار جان نثار ساتھ تھے جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور اپنی قسمتوں کو اِس ہونہار با اقبال کے ہاتھوں بیچے بیٹھے تھے۔ اِس امید پر کہ اِس کے ہاں مینہ برسے گا تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گرینگے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں[1] تھیں جو وفاداری کے ساتھ بے کسی اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔ حسرت و ارمان۔ امید و نا امیدی اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی ایک بگاڑتی تھی۔ بادشاہی دربار قدرائی عجائب خانہ تھا۔ امیر و سردار کہ وہاں سے جواہر کی پتلیاں بنکر نکلتے تھے۔ اِس کے رفیق دیکھتے اور ریجھاتے تھے (دل میں کہتے تھے کہ ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا اُسے جواہرات اور موتیوں

[1] لونڈیاں۔

میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہو جائے! اُس میں سب قدرت ہے۔ وہ چاہے تو پھر وہی تماشہ دکھائے۔ دن رات صبح وشام۔ آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے۔ اور خدا کی طرف دھیان تھے۔ دل آمین آمین کہہ رہے تھے۔

مرزا خان نہایت حسین تھا۔ باہر نکلتا تھا تو رستے کے لوگ دیکھتے رہجاتے تھے۔ ناواقف خواہ مخواہ پوچھتے تھے کہ یہ کون خان زادہ ہے مصور اس کی تصویریں اتار تے تھے۔ امیر اپنے مکانوں اور دیوان خانوں کو سجاتے تھے۔ بادشاہ بھی اپنے دربار اور مجلس کا سنگھار سمجھتے تھے بیرم خاں کے خوانِ کرم کے سینکڑوں نہ تھے ہزاروں کھانے والے تھے۔ کوئی وفا کا بندہ۔ کوئی زمانے کا مارا۔ کوئی عالم۔ کوئی شاعر کوئی اہلِ کمال جو اِسے دیکھتا اور نام سنتا۔ آتا اور دعائیں دیتا۔ بیٹھتا اور اسکا مختصر دیوانخانہ۔ متوسط حالت دیکھ کر باپ کے جاہ وجلال اور نیکیاں یاد کرتا اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ اُن لوگوں کی ایک ایک بات اس کے اور اِس کے رفیقوں کے لئے مرثیوں کا کام کرتی تھی اور خون کو آنسو کر کے بہاتی تھی۔

جب بادشاہ کے ساتھ دہلی۔ آگرہ۔ لاہور وغیرہ میں اس کا گذر ہوتا تھا تو دستکاروں کے تحفے۔ مصوروں کی تصویریں پالیوں کی ڈالیوں سے اس کے حرم سرا میں عجب کیفیتیں پیدا ہوتی تھیں

۹۷۳ھ ہجری میں ایک مبارک شگون کا جلوہ نظر آیا۔ اکبر خان زمان
کی مہم پر تھا۔ اُس نے عفو تقصیر[1] کے لئے التجا کی اور پنجاب سے خبر پہنچی
کہ محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا ہے۔ لاہور تک پہنچ گیا ہے۔ اکبر
نے خان زمان کی خطا معاف کر کے ملک اسکا برقرار رکھا اور آپ پنجاب
کے بندوبست کے لئے چلا۔ مرزا خان کو خلعت و منصب عطا کر کے
منعم خاں کا خطاب دیا (حالانکہ منعم خاں زندہ موجود) اور چند امرا صاحب
تدبیر کے ساتھ آگرے کو رخصت کیا کہ دارالسلطنت کے انتظام اور حفاظت
میں سرگرم رہیں۔

آزاد۔ اس میں دو پہلو تھے۔ اوّل یہ کہ سننے والے صورت نہیں
دیکھتے جو کہیں کہ بڈھا[2] منعم خاں نو (۹) برس کا کیونکر ہو گیا۔ ہاں رعب قایم
ہو گیا۔ کہ کہن سال کاردار گھر پر موجود ہے۔ خان خاناں کا لفظ بھی خوب
ہے۔ باپ اور بیٹے میں کچھ دُور کا فرق نہیں۔ مصالح سلطنت کے
لفظوں کو دیکھو۔ یہی پیچ ہیں جنہیں آج کل کے لوگ ملکی پالیسی کہتے ہیں
اگر نیکی کی غرض اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہو تو مصلحتِ ملک اور دروغ
مصلحت آمیز ہے۔ اگر خود غرضی اور آزار خلایق پر نظر ہو تو دغا اور
فریب ہے۔

اس کے ستارۂ طلوع یا جوہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں
ہر خاص و عام کو نظر آئی جبکہ ۹۸۰ھ ہجری میں خان اعظم مرزا عزیز کو کہ

[1] قصور کی معافی۔ [2] بڈھا تجربہ کار۔

احمد آباد گجرات میں محصور ہوا اور اکبر دو مہینے کی منزلیں سات دن میں طے
کر کے گجرات پر جا کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے کہنہ عمل[1] سردار رہ گئے۔ تیرہ
برس کے لڑکے کی کیا بساط ہوتی تھی مگر وہ قدم بقدم بادشاہ کے ہم رکاب
تھا۔ اُس کے دل کا جوش اور بہادری کی اُمنگ دیکھ کر اُسے قلب[2] لشکر
میں قایم کیا جو عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ ہے۔

اب وہ اِس قابل ہوا کہ ہر وقت دربار میں رہنے لگا۔ اور کاروبار
حضور کا سر انجام کرنے لگا۔ اکثر کاموں کے لئے بادشاہ کی زبان پر
اُسی کا نام آنے لگا۔ اور اس کی جیب بھی ہاتھ ڈالنے کی قابل رہنے لگی[3]

آزاد۔ نوجوانو۔ ناتجربہ کارو! سُنتے ہو؟ یہی موقع اس کے لئے نازک
وقت تھا۔ یاد رہے امیرزادے، شریف زادے جو بدراہ ہوتے ہیں
ان کی خرابی کا پہلا مقام یہی ہے۔ ہاں اِس کی خوش اقبالی کہو یا باپ
کی نیک نیتی کہ یہی موقع اس کے لئے آغاز ترقی کا نکتہ ہوا۔ میں نے
بزرگوں سے سُنا اور خود دیکھا کہ باپ کا کیا بیٹے کے آگے آتا ہے
اور اس کی نیت کا پھل اُسے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ جو روپیہ مرزا خاں
کے پاس آتا تھا یہ اُس سے دسترخوان کو وسعت دیتا تھا۔ اپنی شانِ
سواری اور رونق درباری کو بڑھاتا تھا۔ اہلِ علم و اہلِ کمال آتے تھے
بیرم خانی انعام تو نہ دے سکتا تھا۔ لیکن جو دیتا تھا اس خوبصورتی سے
دیتا تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا دیا دلوں پر بڑی بڑی

---

۱ تجربہ کار۔ ۲ لشکر کے درمیان ۳ یعنی کافی دولت مل گئی۔

بخششوں کا اثر پیدا کرتا تھا۔ مگر اس بیان میں اس کے نمک خواروں اور وفاداروں کی تعریف کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ کہ اس کے سلیقہ اور امتحان کا وقت یہ تھا جس کے وہ برسوں سے منتظر تھے بے شک وہ امتحان میں پورے اُترے اُنہیں کی دانش اور دانائی تھی کہ ہر کام میں تھوڑی سی چیز میں بڑا پھیلاؤ دکھاتے تھے۔ روپیہ خرچتے تھے اور اشرفیوں کے رنگ نظر آتے تھے۔ اور یہی باتیں اُس زمانے میں اُمرا کے واسطے دربار میں ترقی مناصب کے لئے سفارش کیا کرتی تھیں ایشیائی حکومتوں کا قدیمی آئین تھا کہ جس شخص کا سامان امیرانہ اور دسترخوان وسیع دیکھتے تھے اُسی کو زیادہ تر جلد ترقی دیتے تھے۔

۹۸۳ھ ہجری میں اکبر نے احمد آباد کی حکومت مرزا کوکا کو دینی چاہی وہ ضدی امیرزادہ اَڑ گیا اور بگڑ بیٹھا۔ کہ مجھے ہرگز منظور نہیں۔ مقام مذکور سرحد کا موقع تھا اور ہمیشہ بغاوتوں اور فسادوں کی گھوڑ دوڑ سے پامال رہتا تھا۔ اکبر نے خدمتِ مذکور اس نوجوان کو عنایت کی اور اُس نے کمال شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ اسوقت اس کی عمر تئیس برس کی ہوگی۔ بادشاہ نے حسبِ تفصیل ذیل چار امیر تجربہ کار کہ دولتِ اکبری کے نمک پروردہ قدیم تھے اس کے ساتھ کئے اور سمجھایا عنفوانِ[1] شباب ہے اور اول خدمت ہے جو کام کرنا وزیر خاں کی صلاح سے کرنا۔ یہ اس خاندان کے بندہ ہائے قدیمی سے ہے۔

---

[1] شروع جوانی۔

میر علاء الدولہ قزوینی کو امینی۔ پیاک داس کو کہ حساب دانی میں فرد تھا دیوانی۔ سید مظفر بارہا کو بخشی گری فوج پر معزز کیا۔

سنہ ۹۸۶ ہجری میں شہباز خاں کو علاقہ رانا پر فوج لے کر چڑھا۔ مرزا خاں بموجب اس کی درخواست کے مدد کو پہنچے۔ چنانچہ قلعہ مذکور اور قلعہ کوکندہ اور اودے پور فوج شاہی کے قبضے میں آئے۔ رانا ایسے پہاڑوں میں بھاگ گیا کہ شہباز خاں باز کی طرح اُڑا۔ دواسپہ[1] سواروں کو لئے جریدہ[2] اس کے پیچھے پیچھے پھرا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ سپہ سالار اُسکا گرفتار ہو کر حاضر دربار ہوا اور خطا معاف ہوئی۔

خان خاناں کبھی اپنے علاقے میں کبھی دربار میں متفرق خدمتیں بجالاتا تھا اور جوہر قابلیت دکھاتا تھا۔ سنہ ۹۸۸ ہجری میں اس کی سیر چشمی[3] اور خدا ترسی اور اعتبار اور علو[4] حوصلہ پر نظر کر کے عرض بیگی کی خدمت سپرد کی۔ کہ حاجت مندوں کی عرض معروض حضور میں اور حضور کے احکام انھیں پہنچائے۔

سنہ ۹۹۰ ہجری میں جبکہ شہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر) کی عمر بارہ[1] تیرہ[1] برس کی ہوگی اور خان خاناں اٹھائیس برس کا ہوگا اُسے شاہزادے کا اتالیق مقرر کیا۔

آزاد۔ اکثر ریاستوں میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص کو سرکار نے ٹیوٹر (اتالیق) مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اس مقام پر ضرور چند منٹ ٹھہر جاؤ

---

[1] دو گھوڑوں کی ڈاک۔ یعنی جلدی۔ [2] ... [3] فراخدلی۔ [4] عالی ہمتی۔

چاہیئے۔ اور اُس زمانے کے اتالیق اور آج کل کے ٹیوٹر صاحب کو مقابلہ کر کے دیکھ لینا چاہیئے کہ عہدِ سلف کے سلاطین اتالیق میں کیا کیا صفتیں دیکھ لیتے تھے۔ سرکار جو باتیں آج دیکھتی ہے وہ تو سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اوّل یہ دیکھتے تھے کہ اتالیق خود رئیس ہو اور خاندانِ شرافت و ریاست سے ہو۔ رئیس کا لفظ ہی آج تک سب کی زبان پر ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں اس عہد میں تفسیر اس کی بہت شرح طلب ہے۔ ہمارے شاہانِ وقت تو اس سے اتنا ہی مطلب رکھتے ہیں کہ ایک شخص نے مُہم حبش یا کابل پر جا کر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لے کر کبھی نہر کی نوکری کر کے بہت سا روپیہ کما لیا ہو۔ وہ اپنے گھر بیٹھا ہے بگھی پر چڑھ کر ہوا کھاتا ہے۔ جب شاہزادۂ عالم ولایت سے آتے ہیں یا کوئی لارڈ صاحب جاتے ہیں یا کمشنر ایک گنج بناتے ہیں اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہو۔ یہ سرکار میں رئیس ہے اور اسے دربار میں کُرسی ملنے کا بھی حکم ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری ایسی نکالی کہ جس میں تمام شہر کی کثافت[1] نکل جائے اس نے اُس میں پہلے سے بھی زیادہ چندہ دیا بس یہ بڑا صاحبِ ہمت رئیس ہے۔ اُسے خان بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہیئے اور میونسپل ممبر بھی ہو اور آنریری مجسٹریٹ بھی۔ اگر کوئی تحصیلدار یا سررشتہ دار جتاتا ہے کہ خداوند اس میں اہلِ خاندان اور اہلِ ریاست کی دل شکنی ہو گی۔ صاحب کہتے ہیں "ول یہ ہمت والا

[1] گندگی۔

لوگ ہے۔ یہ رئیس ہے۔ اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں تو ہمت دکھائیں ہم اُسے ستارۂ ہند بنائیں گے"۔ تب وہ دیکھیں گے کہ نئے رئیس کا یہ عالم ہے۔ کہ جب گھر سے نکلتے ہیں تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے اور سب کیوں نہیں کرتے خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں اُنہیں زیادہ تر دباتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ریاست جب ہی ثابت ہوگی جب یہ ہمیں جُھک کر سلام کریں گے۔

اب مجسٹریٹی شہر کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ سب کو جُھکنا واجب پڑا۔ نہ جھکیں تو رہیں کہاں۔ مگر ان کی شیخیوں اور نمودوں اور بار بار کے دباؤ دکھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہلِ محلہ تنگ ہیں۔

جنہوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے۔ وہ انہیں یاد کر کے روتے ہیں۔ اور جو انہیں بھول گئے تھے ان کے دلوں میں محبت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہو جاتے ہیں۔ اہلِ نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس اور انگریزی اشراف نام رکھا ہے۔

آجکل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسے میں آئے۔ ایک میر صاحب۔ ایک مرزا صاحب؛ آئیے تشریف رکھئے۔ میر صاحب اہلِ جلسہ سے کہتے ہیں۔ جناب!

آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی؟

حضرت! مجھے تعارف نہیں۔

جناب۔ آپ دہلی کے رئیس ہیں۔

مرزا صاحب ایک طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔ قبلہ ہمارے میر صاحب سے آپ کی ملاقات اب تک نہیں ہوئی۔

جناب بندہ تو محروم ہے۔

آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں۔

اب لکھنؤ میں جا کر پوچھئے۔ میر صاحب کہاں رہتے ہیں۔ کچھ ہول تو پتہ لگے۔ ماں ٹینی باپ کلنگ۔ بچے دیکھو رنگ برنگ۔

مرزا صاحب کو دلی میں ڈھونڈیئے تو باپ دھنیا، ماں پدنیا۔ بیٹا مرزا منیا۔ نئی روشنی اصلیت کا اندھیر۔ جو چاہے بن جائے۔

اب وہ بھی سُن لو کہ بزرگانِ سلف[1] رئیس کسے کہتے تھے۔ اور شاہانِ سلف رئیسوں پر کیوں جان دیتے تھے۔ میرے دوستو! تمہارے بزرگ رئیس اُسے کہتے تھے کہ شریف نجیب الطرفین[2] ہو۔ یہ داغ دامن پر نہ ہو کہ ماں لونڈی تھی یا دادا نے ڈومنی گھر میں ڈالی تھی۔ یاد رکھنا۔ ہزار دولتمند صاحب دستگاہ ہو۔ دغیلے آدمی کا وقار لوگوں کی نظروں میں نہیں ہوتا۔ ذرا سی بات دیکھتے ہی صاف کہہ بیٹھتے ہیں میاں کیا ہے۔ آخر ڈومنی بچہ ہے نہ۔

---

[1] پُرانے زمانے کے لوگ [2] ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شریف۔

ایک کہتا ہے۔ میاں نواب زادہ ہے تو کیا ہے۔ لونڈی کی
یہی تو رگ ہے۔ اثر آوے ہی آوے ؎

پرستار زادہ[1] نیاید بکار
اگرچہ بود زادۂ شہریار

(۲) رئیس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ وہ بھی اور اس کے بزرگ
بھی صاحبِ دولت ہوں۔ اُن کا ہاتھ سخاوت کا پیمانہ ہو اور لوگوں کا
ہاتھ اُن کے دستِ فیض کے نیچے رہا ہو۔ اگر غریب کا بیٹا تھا اب صاحبِ
دولت ہوگیا تو اُسے کوئی خاطر میں نہ لائیگا۔ وہ کسی موقع پر شادی
مہمانی میں کھلانے کھانے میں، لینے دینے میں بلکہ ایک مکان بنانے
میں مصلحتاً بھی کفایت شعاری کرے گا تو کہنے والے ضرور کہدینگے
صاحب یہ کیا جانیں کبھی باپ دادا نے کیا ہوتا تو جانتا ؎

ہر[2] کہنہ گدائے کہ تونگر باشد
صد سال از او بوئے گدائی نہ رود

(۳) اس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ آپ سخی ہو۔ کھاتے
کھلانے والا ہو۔ فیض رساں ہو اور لوگوں سے نیکی کرنے والا ہو۔ اگر
بخیل ہے اور باوجود اختیار کے لوگوں کو اُس سے فائدہ نہیں پہنچتا
تو اُسے بھی کوئی خاطر میں نہیں لائیگا۔ صاف کہدینگے ع

بے فیض اگر حاتمِ ثانی ہے تو کیا ہے

---

[1] لونڈی کا بچہ خواہ وہ بادشاہ کا لڑکا ہی کیوں نہ ہو کبھی کام نہیں آسکتا۔
[2] جو پرانا فقیر امیر بن جاتا ہے تو سو سال تک اُس میں سے فقیری کی بو نہیں جاتی۔

دولت ہے تو اپنے گھر میں لئے بیٹھا رہے ہمیں کیا

سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود

اے ذوق جو وہ آبِ بقا بھی ہے تو کیا ہے

(۴) اس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ نیک اطوار خوش اعمال ہو۔ بدچلن آدمی ہزار دولت والا ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہی ہوتا ہے۔ اس کی دولت آنکھوں میں نہیں جچتی۔ اُس پر بھروسہ نہیں کرتے۔

اچھا ان باتوں سے غرض کیا تھی کہ شاہانِ سلف اور اہلِ شرف اِن اوصاف کو ڈھونڈتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جو شخص اِن اوصاف کے ساتھ امیر ہوگا اور اس کے باپ دادا بھی امیر ہونگے اس کے کلام اور اس کے کام کو تمام لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں بھی وقعت اور وقار ہوگا۔ سب اسکا لحاظ کریں گے اور اس کے کہنے سے عدول کرنے کو ان کے دل گوارا نہ کرینگے۔ ایسے ایک شخص کو اپنا کر لینا گویا ایک انبوہ کثیر پر قبضہ کر لینا ہے۔ وہ جہاں جا کھڑا ہوگا جماعتِ کثیر آ کھڑی ہوگی۔ وقت پر جو کام سلطنت کے اُس سے نکلیں گے کمینے دولتمند سے نہ نکلینگے۔ کمینے کا ساتھ کون دیتا ہے۔ اور جب یہ بات نہیں تو بادشاہ اُسے لے کر کیا کرے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ فضیلتِ علمی کے لحاظ سے عالم فاضل نہ ہو مگر ملک کی زبان ہائے علمی سے واقف ہو۔ اگر ایشیائی ملکوں میں سے ہے تو زبان عربی و فارسی کی معمولی کتابیں پڑھا ہو۔ علوم و

وفنون مشہورہ کی ہر ایک شاخ سے باخبر ہو۔ خود کمالات کا شایق
ہو اور اُن کے ذکر و اذکار سے لطف اٹھاتا ہو۔ کیونکہ بے لطف و
بے علم آدمی جس کا دل و دماغ اس نور سے روشن نہ ہوگا وہ شاگرد
کے دماغ کو کیا روشن کرے گا۔ جس کو ملک کا بادشاہ ہونا ہے
اور کشور اور اہل کشور کے دماغوں کو اُس سے روشن کرنا ہے اگر
اتالیق کا دل علوم کے تذکروں سے لطف اٹھاتا ہوگا اور علم
کی بات سن کر دل چٹخارہ بھرتا ہوگا تو شاگرد کے دل میں بھی اس کی
تاثیر دوڑا سکے گا اور ہمیشہ اس کے دلچسپ چرچے رکھے گا۔ خود
مزہ نہ ہوگا تو روکھی سوکھی خالی عبارتوں کی بک بک سے شاگرد کے
دل کو کیا مائل کر لے گا۔ اور وہ مائل ہی کب ہوگا۔ علمی مطالب اُسکے
سامنے ایسے ڈھب سے پیش کرے کہ جس طرح مزے کی چیز
کھا کر یا خوشبو سونگھ کر یا خوش رنگ پھول دیکھ کر مزہ آتا ہے اُسی
طرح علمی مسائل سُن کر مزہ آئے اور تم خوب سمجھ لو جب تک
علم کا مزہ نہیں تب تک کچھ آنا ممکن ہی نہیں۔ جسے یہ نہیں اُسے
علم کی قدر کیا ہوگی اور اہل علم کی قدر کیا ہوگی اور وہ اپنے ملک
میں علم و کمال کب پھیلا سکیگا۔ اہل کمال اس کے دربار میں کیا
جمع ہو سکیں گے۔ اور یہ نہیں تو سلطنت نہیں۔

اُس زمانے میں مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ نیم علمی زبان
یعنی درباری، دفتری اور مراسلات کی زبان فارسی تھی۔ ترکی کی

عزّت تھی اور نہایت کارآمد تھی۔ جیسے آج انگریزی۔ کیونکہ بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ تمام امراء جو ماوراالنہری[1] تھے۔ ان کی بھی اور اہلِ فوج کی ترکی زبان تھی۔ ایرانی بھی ترکی بولتے تھے اور سمجھتے تو سب تھے۔ اکبر خود بہت خوب ترکی بولتا تھا۔ خان خاناں اگرچہ یہاں پیدا ہوا تھا اور یہیں پلا تھا مگر ترکمان کی ہڈی تھی اور باپ کے نمک حلال وفاداروں کی گودوں میں پرورش پائی تھی اس لئے ترکی خوب بولتا تھا۔ یہ بھی سُن لو کہ تمہارے بزرگ انسان کو کسی زبان کا زباندان اُسی وقت سمجھتے تھے کہ جب وہ اہلِ زبان کے ساتھ تحریر۔ تقریر۔ رہنے سہنے۔ بیٹھنے اُٹھنے میں فقط کارروائی نہ کرسکے بلکہ اُس فصاحت اور مہارت کے ساتھ گذران کرے جس طرح خود صاحبِ زبان بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہ نواب بہادر عربی جانتے ہیں۔ چند اُلٹے سیدھے جُملے یاد کر لئے۔ آئیں بائیں شائیں بتایا اور زباندان ہو گئے۔ صاحب آپ کے زبانیں جانتے ہیں۔ دل پنچتیس[2] بات کرو تو ایک فقرہ صحیح نہیں بولتے۔ لکھواؤ تو ایک سطر ٹھیک نہیں لکھ سکتے۔ ایک صاحب نے ملتان کی زبان میں گفتگو کی کتاب بنائی۔ دو ہزار روپے انعام پائے۔ خود گفتگو سُنو تو دم بخود۔ ایک صاحب نے بلوچی زبان پر ایک کتاب بنائی

---

[1] وہ چیز جو دریا اور نہر کے اُس طرف کی ہو۔ چونکہ ملک توران ایران سے دریائے جیحون کے اُسطرف ہے اس لئے ملک توران کے رہنے والوں کو ماوراالنہری کہتے ہیں۔

بات کرو تو دیدم[1] و لے نہ گویم۔ اس زمانے کے لوگ اسے زباندانی نہ سمجھتے تھے۔

میرے دوستو! اتالیق کی علمیت کے ساتھ اتنا اور یاد رکھو کہ وہ فقط پڑھا ہی نہ ہو، پڑھا بھی ہو اور گنا بھی ہو۔ تم جانتے ہو پڑھنا کیا ہے اور گنّا کیا ہے؟ پڑھنا تو یہی ہے۔ کتابوں کے پٹھوں میں جو کاغذ سفید ہیں اور اُن پر کچھ سیاہ لکھا ہے وہ پڑھ لیا۔ گُنا میں تمھیں کیا بتاؤں۔ وہ تو ایک ایسی شے ہے کہ اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ع

[2] مُلّاں شدن چہ آساں۔ آدم شدن چہ مشکل

اچھا میں گُنّے لوگوں کے کچھ پتے دیتا ہوں۔ انہیں سمجھ لو۔ گُنّے کو تم آپ پہچان لوگے۔ دیکھ لو۔ بے گُنّے لوگ یہی ہیں جنہیں تم دیکھتے ہو کہ کتابیں ورق کے ورق پڑھے جاتے ہیں ایک بیچارے کو چھینک آئی۔ کہدیا کافر۔ کھانا کھا کر ڈکار لی۔ کہدیا کافر۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایمان کیا ہوا، ٹھیس لگی ٹوٹ گیا۔ ایسا اتالیق ہو تو ایک ہفتے میں سارا ملک صاف ہے۔ اُستاد رہے نہ شاگرد رہے۔ باقی اللہ اللہ

شاہانِ گزشتہ اور امرائے سلف علوم ذیل میں علم اخلاق تاریخ دانی، ہیئت[3]، نجوم[4]، رمل[5]۔ شاعری، انشا پردازی، خوشنویسی

---

[1] میں دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن کچھ بول نہیں سکتا۔ [2] مُلّاں بننا آسان ہے لیکن آدمی بننا مشکل ہے۔ یعنی صرف علم سے ہی آدمیت نہیں آتی۔ [3] وہ علم جس میں آسمان کی شکلوں اور زمین کے کرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ [4] ستاروں کا علم۔ [5] وہ علم جس سے گذشتہ زمانے اور آئندہ کی باتوں کا حال معلوم ہو۔

مصوری وغیرہ وغیرہ فنون کے اجزائے کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے۔ اِن کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے تاکہ بھلے بُرے کو پرکھ سکیں۔ شہ سواری، تیر اندازی۔ نیزہ بازی شمشیر زنی وغیرہ وغیرہ سپہ گری میں اعلیٰ درجے کی مشق پیدا کرتے تھے صید افگنی کو ذریعہ مشق رکھا تھا۔ مگر یہ ہنر اکبر ہی کے وقت تک کار آمد رہے۔ کیونکہ وہی تھا جو یلغار کر کے فوج لے جاتا تھا اور دفعتاً دشمن کی چھاتی پر جا کھڑا ہوتا تھا۔ میدانِ جنگ میں خود کھڑے ہو کر فوج کو لڑاتا تھا اور آپ تلوار پکڑ کر حملہ کرتا تھا۔ گھوڑا دریا میں ڈالتا تھا اور پار اُتر جاتا تھا۔ پھر کوئی بادشاہ اس طرح نہیں لڑا۔ آرام طلب ہو گئے۔ خوشامدی کہتے ہیں۔ حضور آپ کا اقبال مارے گا۔ حضور بیٹھے خوش ہو رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ شکار اور فنون مذکورہ جب تک اس غرض سے ہیں تب تک ہنر با کمال جو کہو درست۔ یہ نہ ہو تو وہی عالمگیر کا قول "شکار کار بیکارانست[1]"

علمِ مجلس کہ جزیات مذکورہ کی معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے اسکا جزوِ اعظم فصاحتِ کلام اور حسنِ تدبیر ہے اور وہ ایک خداداد امر ہے۔ جیسے خدا دے۔ ایک عالم فاضل آدمی ایک مطلب کو بیان کرتا ہے کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا کہا۔ ایک معمولی پڑھا

---

[1] شکار بیکاروں کا شغل ہے۔

لکھا آدمی کسی دربار یا جلسے میں اِس طرح بات کہتا ہے کہ بے علم نوکروں تک کے کان بھی اِدھر ہی لگ جاتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت اور موقع کلام کو پہچانے کہ آنکھوں کے رستے دل میں اُتر جائے۔ ہر ایک کی طبیعت کا انداز پائے۔ اِسکے بموجب اپنے مطالب کو لباس تقریر پہنائے اور رنگِ بیان چڑھائے غلام ہوں صاحبِ کلام سحر بیانوں کا کہ ایک بھرے جلسے میں تقریر کر رہے ہیں مختلف الرائے مختلف خیال۔ مختلف مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں۔ مگر ان کی تقریر کا ایک نقطہ بھی کسی دل پر ناگوار ہو کر نہیں کھٹکتا ایک خونچے والے کا لڑکا یا ایک جُلاہے کا بیٹا مسجد میں رہ کر عالم فاضل ہو گیا۔ یا کالج میں پڑھ کر بی۔ اے، ایم۔ اے ہو گیا تو ہوا کر مقاصد مذکورہ بالا اور علم مجلس اور آدابِ محفل کی اس غریب کو کیا خبر۔ وہ آپ ہی نہیں جانتا شاگرد کو کیا سکھاوے۔ درباروں سرکاروں کی ڈیوڑھی تک اس کے باپ دادا کو جانا نصیب نہ ہوا۔ وہ بیچارہ وہاں کی باتیں کیا جانے اور کہیں لکھا دیکھ کر یا سُن سُنا کر معلوم بھی کر لیا تو کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں اور وہ لوگ کہاں جو اسی دنیا کی مجلس کے تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تبرک بڑے ہوئے تھے ان کا دل کھلا ہوا تھا ان کو وقت پر قواعد اور آداب کے سوچنے کی ضرورت نہ تھی اپنے موقع پہ خود بخود اعضا میں وہی حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ دیکھ لو۔ اب بھی

لے اس بات کو خوب جانتے تھے۔

نئے روشن ضمیر نوتعلیم یافتہ کہیں جا پہنچتے ہیں تو سلام کرنا بھی نہیں آتا۔ میرے دوستو! اُن کے ہوش یکجا نہیں رہتے۔ چلتے ہیں قدم ٹھکانے نہیں پڑتا اور نظر بازبھی وہیں کنارے کھڑے ہیں۔ بات بات کو پرکھ رہے ہیں کہ یہاں چُوکا وہاں بھُولا۔ یہ ٹھوکر کھائی۔ وہ گر پڑا۔ پھر صاف کہہ دیتے ہیں کہ مولوی صاحب خواہ بابو صاحب ٹکسال باہر ہیں۔ خیر اب نہ وہ دربار نہ وہ سرکار۔ جہاں ٹوٹا پھوٹا کارخانہ ہے اس کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ خوب ہوا خدا نے سب کا پردہ رکھ لیا۔

(از دربارِ اکبری)

پنڈت رتن ناتھ در نام اور سرشار تخلص۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے آخری دَورِ حکومت میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ابتدائے سِن میں فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی زبان بھی سیکھ لی۔

چند سال تک انگریزی اسکولوں میں مدرسی کے فرائض انجام دئے۔ اُسی زمانے میں ایک جغرافیہ کی کتاب "شمس الضحےٰ" لکھی۔ ۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور کی قدر دانی سے اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اسی سال اودھ اخبار میں فسانۂ آزاد کی بنیاد ڈالی جو کئی سال تک قسطوں میں شایع ہو کر مقبول خاص و عام ہوا۔ اردو میں فسانۂ آزاد سب سے پہلا ناول ہے۔ اس لئے اس زبان میں ناول نویسی کے موجد سرشار ہی سمجھے جاتے ہیں۔ فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی تصانیف میں جامِ سرشار۔ سیر کوہسار اور کامنی وغیرہ بھی مشہور ہیں لیکن جو مقبولیت فسانۂ آزاد کو حاصل ہوئی کسی اور

تصنیف کو نصیب نہ ہو سکی۔

فسانۂ آزاد کا ہیرو آزاد اور ان کے دوست خوجی اردو ادب میں زندۂ جاوید ہیں اس سے اس کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

سرشار کی زبان سلیس اور پاکیزہ ہے۔ اور لکھنؤ کی بول چال کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ ان کی تصانیف میں لکھنؤ کی اسلامی تہذیب کے ہر پہلو کی تصاویر موجود ہیں۔

آخری عمر میں سرشار حیدرآباد دکن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے سایۂ عاطفت میں رہے اور ۱۹۰۲ء میں وہیں انتقال کیا۔

میاں آزاد اور بانکے

میاں آزاد زمین کا گز بنے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڈھے کھوسٹ نے ایک بانکے سے کہا۔ کہ میاں بیڈھے[1] آئے ہو یا جان وبال ہے یا زندگی دوبھر ہے یا چھینکتے[2] گھر سے چلے تھے، یہ اکڑنا اور بگڑنا کیا معنی۔ یہاں گردن جھکا کر چلا کیجیے ورنہ کوئی پہلوان گردن ناپے[3] گا تو یہ شیخت[4] ساری خاک میں مل جائے گی۔ تننا اور اینڈنا بھول جائیے گا۔ مفت میں کرکری ہوگی۔ اس سے کیا واسطہ۔ یہ شہر کشتی، پٹے، بانک، لکڑی کی ٹکسال ہے۔ بہت سے لڑنتے[5] آئے مگر پخنی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی یہاں کے پہلوان پکڑ لائے اور بارا چاروں شانے چت[6] لنگری پر اڑا لے میں طاق۔ سواری کسنے میں مشتاق۔ کولے پر لادنے میں بُرّاق۔ یہ سنتے ہی وہ میاں بانکے آگ بھبھوکا ہو گئے۔ "جی تو کہیں اس بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ بندہ پخنی کھانے والا آدمی نہیں ہے

---

[1] پاگل۔ [2] توہم پرست لوگوں کا خیال ہے کہ اگر گھر سے چلتے وقت چھینک آ جائے تو بہت منحوس ہوتی ہے۔ [3] پیٹے گا۔ [4] شان۔ رعب [5] لڑنے والے [6] یہ سب کشتی کے داؤ ہیں۔

بیچ کھیت[1] پچھاڑوں تو سہی۔ قربان اپنے اُستاد کے جنہوں نے ہمیں
لکڑی سکھائی۔ ہمارے اُستاد تیس تیس آدمیوں سے لڑتے تھے، اور
کون لوگ۔ ایسے ایسے گنوار گھامڑ[2] نہیں۔ پڑھے ہوئے پٹھے جن پہ
ان کو ناز تھا۔ پھر یہ خیال کیجئے کہ تیس گتکے برابر پڑتے تھے مگر
تیسوں کی خالی جاتی تھیں۔ کبھی آڑے ہو گئے۔ کبھی گتکے سے چوٹ
کاٹ دی۔ کبھی بدن کو سمیٹ لیا۔ کبھی پیترا بدل دیا۔ شاگردوں
کو للکارتے جاتے تھے کہ لگا بڑھ کے ہاتھ، آنکھ سینک کے اور جھلّا
جھلّا کے چوٹیں لگاتے تھے مگر مُنہ کی کھاتے تھے اور اپنا سا مُنہ
لے کر رہ جاتے تھے۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو
گتکے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑے۔ مگر واہ رے استاد۔ اُن کے
وہی دم خم وہی چیتون، وہی تاؤ بھاؤ۔ پہروں لکڑی پھینکیں لیکن دم نہ پھولے
اور جو کہیں بھڑ بھِڑ[3] پڑے تو بات کی بات میں پَرے کے پَرے صاف تھے۔ پھر بس
یہی معلوم ہوتا تھا کہ پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔ یا آتش بازی کی چھچھوندر
ناچ رہی ہے (استاد کی اچھی تعریف کی) یا چرخی چکر میں ہے۔ گتکا
ہاتھ میں آیا اور معلوم ہوا کہ بجلی کوندنے لگی۔ ممکن نہیں کہ انسان
کی آنکھ نہ جھپکنے پائے اور آدمی تیورا[4] نہ جائے۔ نشانہ تو کبھی خالی ہی
جانے نہیں دیا۔ تاکا اور بھرپور ہاتھ لگایا۔ اُن کے ٹھاٹھ ہی نرالے
ہیں۔ چھریرا بدن، سادہ مزاج۔ آدمی صورت دیکھے تو یقین نہ آئے

[1] اجڈ۔ [2] بے وقوف۔ [3] لڑ پڑے۔ [4] قطاریں [4] چکرا نہ جائے۔

کہ یہ استاد بے بدل ہیں۔ مگر ایک ذرا سی بانس کی کھپاچ دیجئے پھر دل لگی دیکھئے کہ کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ میاں ہم ایسے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ پٹے۔ بانے۔ بنوٹ۔ کشتی۔ لکڑی کسی میں بند نہیں۔ جی چاہے کسی سے بھڑوا کر دیکھ لیجیے۔"

اتنے میں ایک گنوار کا لڑکا چلا جاتا تھا۔ اُنہوں نے پکارا کہ ارے ذرا اِدھر آنا۔ اِدھر اُدھر کی بات سنتے جاؤ۔ لڑکا قریب آیا تو پوچھا کہ ان سے دو چوٹیں ہوتی ہیں۔ اُس نے نظر بھر کر دیکھا اور کہا۔ ہاں ہم کسی سے دب کے نکلنے والے نہیں جس کا جی چاہے ارمان نکال لے۔

بانکا۔ ابے جا ایسے دیہاتی چھوکرے ہم نے بہت چرائے[1] ہیں

گنوار۔ جی تو کہیں سوریاں چرائی ہونگی۔ دیہاتی چھوکروں سے شیطان نے پناہ مانگی ہے۔ آپ ہیں کس شمار قطار میں۔ ہم نے بھی شہر ہی میں تعلیم پائی ہے ان گیدڑ بھبکیوں میں او رآتے ہونگے

گنوار تو یہ فقرے سُنا کر چلدیا۔ میاں آزاد اور بانکا پھر شہر میں چکر لگانے لگے۔ چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑتی ہے بانکا، ترچھا، تیکھا، چُنّت دار انگرکھے پہنے، نگے دار کٹی ہوئی ٹوپیاں سر پر جمائے چُست گھٹنے ڈالے تنے چلے جاتے ہیں۔ تینچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی۔ دو دو لاٹھیاں[2] پڑی ہوئیں۔ باڑھیں[3] چڑھی ہوئیں، قرابنچہ[4]

---

[1] پڑھائے ہیں۔ [2] تلواریں۔ [3] تیز دھار والی [4] چوڑے منہ کی تلوار۔

پیش قبض، کٹار، سروہی، شیر بچہ سب سے لیس۔ خاصے اونچی بنے ہوئے
ایک بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار شامتِ اعمال سے کہیں ہنس پڑا
اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دَن سے تمنچہ داغ دیا۔ مگر حسنِ اتفاق سے
خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا، کیوں آغا[1] کیوں بگڑ گئے۔ تیکھے ہو کر فرمایا
کہ ہم کو دیکھ کر بچہ جی مسکرائے تھے۔ ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر
پڑے اور اس جواب دنداں شکن سے اُن کے دانت بھی کھٹے ہو جائیں
مگر زندگی تھی کہ گولی سے بچ نکلا۔

میاں آزاد دل میں سوچے کہ یہ بانکے تو بالکل ناخدا ترس[2]
ہیں ان کو زیر[3] نہ کیا تو کچھ بات نہیں۔ ایک تنبولی[4] سے پوچھا کہ کیوں
بھئی اس شہر میں بانکے بہت ہیں۔ اُس نے کہا میاں بانکا ہونا تو دل لگی
نہیں۔ ہاں یوں کہیے کہ بے فکرے بہت ہیں اور ان سب کے
گرو گھنٹال وہ ذاتِ شریف ہیں جن کو لوگ یک رنگ کہتے ہیں۔ وہ
صندلی رنگا ہوا جوڑا پہن کے نکلتے ہیں۔ مگر مجال کیا کہ شہر بھر میں کوئی
صندلی جوڑا پہن تو لے۔ یکرنگ صندلی جوڑا کوئی پہن نہیں سکتا۔
کوئی پہنے تو گولی بھی سر کر دیں۔

میاں آزاد سوچے کہ اس یک رنگ کا ٹیٹوا نہ لیا تو کھانا حرام،
دوسرے دن حضرت بھی صندلی بوٹ، صندلی گھٹنا، صندلی انگرکھا
صندلی ٹوپی دے کر نکلے۔ میاں بھی صندلی۔ اب جس گلی کوچے

[1] آغا سے بگڑا ہوا لفظ ہے۔ بانکوں کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔ [2] بے رحم۔ [3] شکست دینا
[4] پان والا۔

بازار سے گذر ہوتا ہے لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ آج اس ڈھب سے کون نکلے ہیں۔ بھئی چوطرفہ اُنگلیاں اُٹھنے لگیں۔ شدہ شدہ حضرت یکرنگ کے چیلے چاپڑ نے اُن کے کان میں بھی بھنک ڈال دی۔ سُنتے ہی مُنہ لال چقندر ہو گیا۔ کپڑے پہن ہتھیار لگا چل کھڑے ہوئے میاں آزاد تنبولی کی دُکان پر جا کر ٹھٹک گئے۔ اُن کی وضع دیکھتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے اور منت کرنے کہ ازبرائے خدا میری ٹوپی دے لیجئے۔ یا جوتا بدل ڈالئے۔ ورنہ وہ آتا ہی ہوگا۔ بعنت کی ٹھائیں[1] ٹھائیں سے کیا واسطہ۔ ان کو تو کچے گھڑے[2] کی چڑھی تھی یہ ماننے کب تھے۔ گلوری لی اور اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اِردگرد تماشائیوں کا ہجوم ہے اور شہر بھر میں دھوم ہے کہ آج یکرنگ سے تلوار چلیگی۔ اتنے میں حضرت یکرنگ بھی نمودار ہوئے۔ تنبولی نے میاں آزاد سے کہا کہ سنبھلئے وہ ع

آتے ہیں تیغچے کو چڑھائے ہوئے کل پر

اُن کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوئی اِدھر کترا گیا کوئی اُدھر دبک گیا۔ کوئی گلی میں گھسا۔ کوئی کمرے پر چڑھ گیا۔ یکرنگ نے جوان کو دیکھا کہ ازسرتاپا صندلی پوشاک پہنے ہے۔ تو جل ہی مرا۔ نظر قہر آلود ڈال کر کہا اے بیہودہ[3] خبطہ! اتار ٹوپی۔ بدل، جوتا۔ گستاخ! ہمارے ہوتے سا تے

---

[1] لڑائی جھگڑے [2] کچے گھڑے کی شراب میں بہت زیادہ نشہ ہوتا ہے۔ اس لئے جو بہت مست اور بے فکر ہو اُسے کہتے ہیں کہ اس نے کچے گھڑے کی پی ہے [3] پاگل۔ بیوقوف۔

توصندلی جوڑا پہن کر نکلے۔ تیرے اور خم و دم۔ اُتار اُتار نہیں ہیں بڑھ کر
کام تمام کردونگا۔ میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے اور
نہایت پھرتی سے یکرنگ کی توند پر پنجہ رکھدیا۔ اوخرنا[۱] خفیف جنبش کی اور
دھواں اُس پار۔ ہلا اور دائیں کی آواز آئی۔ بولا اور لاش پھڑکنے لگی۔
مردک بڑا بانکا بنا ہے۔ صد ہا شرفا کو بے عزت کیا۔ تم جیسے بدمعاش
اور بانکپن کا دم بھرو۔ اتنے چابک مارونگا کہ یاد کروگے بچہ۔ ابھی اُتار
ٹوپی۔ اُتار اُتار نہیں دھواں اُس پار۔"

اتفاق سے کہیں ایک درزی کا اُدھر سے گذر ہوا۔ میاں خلیفہ
کی لپڑی[۲] اتار یکرنگ کی چیت[۳] گاہ پر رکھی اور یکرنگ کی صندلی ٹوپی
اپنی جیب میں رکھلی۔" بات تری ایسی تیسی۔ بڑے بانکے بنے تھے
شہر بھر میں کوئی یکرنگ جوڑا نہ پہنے۔ نادری[۴] حکم لگادیا۔ زیردستوں عزیزوں
شریفوں کو بہت ستاتے تھے۔ ہم سے ایک نہ چلی۔ حوصلہ ہو تو آؤ۔ دو دو
ہاتھ بھی ہوجائیں۔ خبردار جو آج سے صندلی جوڑا پہنا تو تم جانو گے۔"

شہر بھر میں یہ دھوم ہوگئی کہ میاں آزاد نے یکرنگ کے چھکے
چھڑا دیئے۔ گھگھی بندھ گئی۔ چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدل لی۔
سچ ہے دبلے پر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔ اب تو میاں آزاد
پر بانکوں کی بھی نظر پڑنے لگی۔ جس ٹکڑی[۵] میں جاتے تھے لوگ تعظیم
پیش آتے تھے۔ ایک دن اُنہوں نے منادی کردی۔ آج میاں

---

[۱] بغیر مالک کا گدھا۔ [۲] ٹوپی [۳] سر۔ چندیا۔ [۴] نادر شاہ جیسا زبردست حکم۔
[۵] جماعت۔ پارٹی۔

آزاد چھ بجے صبح سے آٹھ بجے تک اپنے فن کے کرتب دکھائیں گے
جن اصحاب کو شوق ہو آئیں اور حظ[1] اٹھائیں۔ روزِ معینہ کو ایک فراخ و
وسیع میدان میں غٹ کے غٹ جمع ہوئے اور میاں آزاد نے طرح
طرح کے جوہر دکھائے۔ لیموں پر نشان بنایا اور تلوار سے اُڑایا تو
نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے۔ کسیرو اُچھالا اور پانچ چھ مرتبہ
میں چھیل ڈالا۔ تلوار کی باڑھ سے دس بارہ کی آنکھوں میں سُرمہ لگایا
چراغ جلایا اور کھانڈا پھیکتے پھیکتے گُل کاٹ ڈالا۔ لو الگ بتی الگ
ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھیں اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں
کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں تلوہ[2] بچ نکلیں لکڑی
ٹیکی اور چھت پر ہو رہے۔ گتکے کا ذرا اشارہ کیا اور بیس ہاتھ اُڑ گئے
چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور یہ صاف نکل بھاگے۔ پلنگ کے
نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا انہوں نے اسکو نکلنے نہ دیا۔ وہ لاکھ
کوشش کرتا رہا مگر پھڑپھڑا پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا۔ اتنے میں ایک
پھکیت[3] بولے۔ "اجی یہ شعبدہ بازی ہے۔ میدانِ کارزار میں سامنا
ہو تو جانیں۔"
آزاد۔ ہاں یہ دعویٰ۔ اچھا فیصلہ[4] خواہد شد۔ تمہارے یکرنگ
سنگے[5] شیار کا رنگ تو پھیکا ہو گیا۔ اب تم مُنہ آتے ہو کسی دن گردن
ناپوں گا۔

[1] لطف۔ [2] بالکل [3] لکڑی چلانے والے [4] دیکھا جائیگا [5] دھوکہ باز گیدڑ۔

پھکیت۔ چونچ سنبھالو نہیں ہم تمہاری خبر لیں گے۔

آزاد۔ یہی دلی خواہش ہے کہ تم جتنے گو گھٹے[1] بانکے ہو سب کو نیچا دکھاؤں اور تمہارا بل نکالوں۔ دیکھو صبح و شام تمہاری بھی قلعی کھلی جاتی ہے۔ تم لوگ بانکے نہیں مردم آزار، خونخوار، ناخداترس ہو۔ جس طرف سے نکل جاؤ اُدھر آدمی کانپ اُٹھیں کہ بھیڑیا آیا کوئی ہنسا اور تم نے بندوق چھتیائی[2] کسی نے بات کی اور تم نے چوٹ لگائی۔ بھئی واہ اچھا بانکپن ہے۔ تو وجہ کیا۔ جہاں دس ڈنڈ پیلے اور اُبل پڑے دس بارہ دن لکڑی پھیکی اور محلہ والوں پر شیر ہو گئے۔ ورنہ باکمال کو ہمیشہ بُردبار ہی دیکھا۔ جب سے رذیلوں میں پھکیتی، بنکیتی، بانا، پٹا شروع ہو گیا۔ تب سے شرفا اس کو معیوب سمجھنے لگے۔ اور یوں اونچی بن کر اور خوب تن کر نکلنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ مگر فن کا جاننا اور ہی شے ہے

اتنے میں میاں آزاد کے قریب سے ایک پہلوان اینڈتے ہوئے نکلے۔ چٹ لنگوٹ باندھے، ململ کی چادر اوڑھے۔ دو تین پٹھے ساتھ۔ ایک کیسرو والے کی چپت گاہ پر پہلوان نے خداواسطے کو دھپ لگا دی۔ وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو ڈھوّہ[3] کا ڈھوہ آدمی۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ بولے تو خوب پٹھا جائے[4]۔ کان دبا کر دھپ کھا کر دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا۔ ایک تھوڑی ہی دیر میں میاں پہلوان نے ایک خوانچہ والے کا خوانچہ اُلٹ دیا۔ تین چار روپے کی

---

[1] جھوٹے مکار [2] بندوق چلائی۔ [3] موٹا تازہ آدمی [4] پیٹا جائے۔

مٹھائی خاک میں مل گئی جب اُس نے خوب ہی غُل غپاڑہ مچایا تو شاگردوں نے سر سہلایا۔ دو تین گدّے، گھونسے، مُکے لگا دیئے۔ دو چار لپّڑ جما دیئے۔ وہ بیچارہ روتا چلّاتا دُہائی دیتا چلا گیا۔ دُہائی ہے۔ میرا خوانچہ لوٹ لیا۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شورہ پشت معلوم ہوتا ہے۔ کسی پر لپڑ، کسی پر تھپیڑ۔ واہ کیا پہلوانی ہے اسکی خبر نہ لی تو کچھ نہ کیا۔ اُس نے تو شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ سوچتے ہی میرا شیر جھپٹ پڑا۔ اور پہلوان کے پاس جاکر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے با ایں ہمہ تن و توش تین لڑھکنیاں کھائیں اور سنبھلتے ہی اُن کی طرف ڈپٹ پڑے۔ یہ بھی شیر نر کی طرح ڈکارتے ہوئے چلے۔ تماشائی تو سمجھے کہ پہلوان قوی ہیکل کس بل کا آدمی ہے چر مُر کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے سے ہی وہ داؤ پیچ کئے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آیا۔ پہلوان نے جیسے ہی میاں آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا اُنہوں نے داہنے سے اُسکا ہاتھ باندھا اور اپنا چھڑا لیا اور چٹکیوں میں کولے پر گھٹنا ٹیک کر مارا[1] چاروں شانے چت۔ یا علی۔ پہلوان اب تک کورا[2] تھا کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میاں آزاد نے جو سرِ بازار ایک تختی بتائی اور اُس نے ہزاروں آدمیوں

---

[1] مارا۔ [2] اب تک کسی سے نہیں گرا تھا۔

میں پچھاڑ کھائی تو بڑی کرکری ہوئی اور تمام عمر کے لئے داغ لگا۔ میاں آزاد نے شاداں و فرحاں اور اس پہلوان نے نالاں و گریاں وہاں سے اپنی اپنی راہ لی۔

اب تو میاں آزاد جگت اُستاد ہو گئے۔ یکرنگ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہلوان نے پٹخنی کھائی اور وہ وہ جوہر دکھائے کہ لوگ دم بھرنے لگے بنکیتی، پھکیتی، کُشتی۔ شورہ پُشتی کی شہر بھر میں دھوم تھی۔ جدھر جاتے تھے لوگ تعظیم بجا لاتے تھے۔ جس سے چار آنکھیں ہوئیں اُس نے فراشی سلام کیا۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور[1] دینے لگی۔ جہاں کسی زبردست نے زیر دست کو دبایا اور اس نے غل مچایا۔ دُہائی میاں آزاد کی۔ دُہائی اُستاد کی۔ اور یہ بانڈ[2] لے کر آن موجود ہوئے کمزور کو کسی مردم آزار نے ذرا ایذا پہنچائی اور اس نے ڈانٹ بتائی ہائیں نہیں مانتے۔ بلاؤں میاں آزاد کو۔ شہدے، لُچّے، لُٹیرے، لُچّے میاں آزاد سے ایسے تھراتے تھے جیسے چوہے بلّی سے یا مریض تلی سے۔ نام سُنا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔ الغرض شہر بھر میں اُن کا ڈنکا بج گیا۔ چوطرفہ سکّہ بٹھا دیا۔ ایک دن میاں آزاد سروہی[3] لئے اینڈتے جا رہے تھے اور لوگ انگلیاں اُٹھا رہے تھے کہ ایک درزی کی دُکان کے قریب سے ان کا گذر ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں تیرھویں

[1] ان کے مقابلے میں دبنے لگے [2] لکڑی۔ [3] ایک قسم کی تلوار۔

صدی کے ایک رنگیلے، چھیل بانکے، ترچھے جوان، چھوٹے پنچے کا چڑھواں مخملی جوتا پہنے، زلفیں لٹکائے، چھُری کمر سے لگائے درزی سے تکرار کر رہے ہیں۔

بانکے۔ واہ میاں خلیفہ تم نے تو ہمیں اُلٹے اُسترے[1] سے مونڈا۔ واللہ عجیب قطع کے آدمی ہو بھئی۔ میں تو زمین کا گز بن گیا۔ جب کہیں یکسوئی ہاتھ آئی اور جوشے سلوانی ہوئی تم سے سلوائی۔ مگر تم خدا جانے کس کتر بیونت میں رہتے ہو، سینا پرونا بخیر۔ ہاں زبان البتہ کترنی[2] کی طرح چلا کرتی ہے۔ تم سے کپڑا سلوانا اپنے کو انگشت نما[3] کرنا ہے۔ تمہارے رشتہ دار سب استاد ہیں مگر تم نرے گھامڑ نکلے ہاں دم دھاگا[4] دینا خوب جانتے ہو۔ ٹوپی ایسی بھونڈی بنائی کہ یاران سرپل[5] نے پھبتی پر پھبتی سنائی۔ واللہ ہمارے ایک شفیق[6] کا درزی کیا ٹوپی سیتا ہے کہ سر پر قالب کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

خلیفہ۔ اسے تو حضور میں اس کو کیا کروں۔ میرا بھلا اس میں کیا قصور۔ آپ کا سر ہی کاواک[7] ہے۔ میں ٹوپی بناتا ہوں سر بناتا نہیں جانتا۔

بانکے۔ او گیدی[8] چونچ سنبھال۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنا نہیں مارتے مارتے اَتو[9] کر دونگا۔ جامے[10] سے باہر ہوا جاتا ہے۔

[1] خوب بیوقوف بنایا۔ [2] قینچی۔ [3] بدنام۔ [4] دھوکہ فریب [5] یار دوست ساتھی [6] مہربان دوست۔ [7] ٹیڑھا۔ [8] بے وقوف۔ [9] بہت زیادہ مارونگا۔ [10] حد باہر سے نکلنا

بانکوں کے مُنہ آتا ہے اور سُنئے ہمارا سر کاواک ہے۔ ابے تیرا سر سانچے کا ڈھلا ہے۔ چومغزا نامعقول۔ ابے تیرے ایسے ایسے درزی میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے لکڑی کھونس دوں ملعون کے حلق میں۔ مُنہ بند کرنہیں دونگا الٹا ہاتھ تو ٹیڑھا ہو جائے گا اور تماشہ دیکھئے۔ ہمارا سر گویا کدو ہو گیا۔ ہم چومغزے ہیں۔ کان کتر لونگا بچہ۔

درزی۔ حضور مالک ہیں۔ مُل[1] میری کھتّا[2] نہیں۔ جیسا سر ویسی ٹوپی۔ ایسا سر تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ نئی گڑ ہت کا سر ہے۔ صاحب پہنچ پی[3] ہزار نعمت کھائی۔ آپ پھیر لیں۔ بس میں سی چکا۔ بھر پایا جب دام دینے کا وقت آیا تو یہ نقرہ سنایا۔

یہ سُنتے ہی بانکے نے درزی کو چپر غٹو[4] کیا اور اس درجہ پیٹا کہ وہ بے چارہ بے دم ہو گیا۔ آخر کار کفن پھاڑ کر چیخا کہ دُہائی میاں آزاد کی۔ دُہائی میرے اُستاد کی۔ میاں آزاد تو دُور سے کھڑے سیر دیکھ ہی رہے تھے جھٹ تلوار سُوت عین موقع واردات پر پہنچ گئے۔ ”سنبھل او آنکا کی دُم، بانکپن کا دعویٰ اور تم“۔ پیچھے پھر کے دیکھا تو میاں آزاد جگت اُستاد۔

آزاد۔ اس ڈنڈبل کے قربان۔ واہ بھئی پہلوان۔ تم تو رستم داستان ہو۔ خلیفہ بیچارے پر ساری چوٹیں کر دیں۔ کبھی کسی کڑے خال سے

---

[1] یہ تکیہ کلام کے طور پر استعمال ہوتا ہے [2] خطا قصور۔ [3] میں ایسی مزدوری سے باز آیا [4] مارا۔

بھی پالا پڑا ہے۔ یا غریبوں ہی پر شیر ہو۔ بڑے دلیر ہو تو آؤ ہم سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ تم ڈھیر ہو جاؤ یا ہم چیر[1] کا کھا جائیں۔ آئیے پھر پینترا بدلئے۔ اسے ہے تو اب تال[2] کیا ہے۔ لے تیغ دو دم اور لگا بڑھ کے ہاتھ ادھر یا ادھر۔

بانکے ہائیں، ہائیں! اُستاد ہمیں پر ہاتھ صاف کرنے کا داعیہ[3] ہے۔ ہماری تلوار تم پر اور تمہاری سروہی ہم پر چلے۔ کیا مجال ہم ابھی تو سیکھے تم گرو گھنٹال۔ کجا چیر کو الجھا طاؤس[4] زمردیں بال اور اِس کمینے درزی کی طرف سے آپ بولتے ہیں اور شریفوں پر تلوار تولتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ آئیے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آگے اپنا اپنا لہنا[5] ہے۔ شاد[6] باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ مصیبت تکلیف سب کچھ سہنا ہے۔ اگر تم تکلیف کرو تو بیڑا پار ہے ورنہ ہم ہیں اور منجدھار ہے۔

آزاد۔ اچھا توبہ کرو کہ اب کسی غریب زیر دست کو نہ دھمکاؤ گے

بانکے۔ اجی حضرت دھمکانا کیسا ہم خود بلا میں پھنس گئے۔ خدا ہی بچائے تو بچیں۔ صاف صاف یوں ہے کہ یہاں ہمارا ایک پٹیت[7] ہے کمیدان۔ بلا کا پھکیت[8] ستم کا بنکیت[9]۔ قیامت کا ہاتھ ہے۔ اُس سے ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ کل نوچندی[10] جمعرات کو ہمیں درگاہ میں گھیریگا

---

[1] زخم۔ [2] سوچ بچار۔ ہچکچاہٹ۔ [3] ارادہ۔ [4] سُنہری پروں والا مور۔ [5] قسمت۔
[6] خوش ہو کر رہو یا رنجیدہ۔ زندہ رہنا ہی پڑیگا۔ [7] پٹے باز۔ [8] پھکیتی جاننے والا۔
[9] بانا جاننے والا۔ یہ سب لکڑی چلانے کے مختلف فن ہیں [10] چاند کے مہینے کی پہلی جمعرات۔

کوئی دو سو بانکوں کی جماعت سے ہم پر حربہ[1] کرنے کا قصد ہے۔ ع
اُس طرف ساری خدائی ہے اِدھر کچھ بھی نہیں
ہم سوچتے ہیں کہ درگاہ نہ جائیں تو بانکپن میں حرف آتا ہے۔ جائیں تو کبر برتے پڑ۔ یار تم ساتھ چلو تو مزے ہیں۔ ورنہ بے موت مرے۔
آزاد۔ بس اتنے ہی کے واسطے، لو تمہارا ساتھ دیتے ہیں بیڑا اٹھا لیا کہ کل تم کو لے چلیں گے۔ اور سب سے بھڑ پڑینگے۔ دو سو ہوں خواہ ہزار، ہم ہیں اور ہماری تلوار۔ خنجر ہے اور کٹار۔ اتنی کٹاریں بھونکو کہ دم بند ہو جائے۔ مگر یہ بتا دو کہ تمہارا قصور تو نہیں ہے۔
بانکے۔ نہیں اُستاد شہید کربلا کی قسم، جو میری جانب سے پہل ہو تو ناک کاٹ لیجئے اور جو چاہے سزا دیجئے۔ مجھ سے اُنہوں نے ایک دن اکڑ کر کہا کہ تو تلوار نہ باندھا کر، میں بھی آپ جانئے اِن ہوں، بشر ہوں، فرشتہ نہیں، ملک[2] نہیں مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ دَت! تو اور ہم سے ہتھیار رکھوا لے۔ اے تیری قدرت اتنے میں لگا بے نقط سنانے اور پندرہ بیس آدمی اُس کی طرف سے بولنے لگے بمصلحت وقت سمجھ کر میں نے بھی دو چار باتیں کہیں، د. نہیں۔ مگر لڑ پڑنا خلافِ عقل سمجھا۔ بانکا ہوں تو کیا ہوا لیکن بے سمجھ بوجھے بات نہیں کرتا۔ خیر اُس نے بآواز بلند کہا کہ اچھا چِڈا[3] درگا میں سمجھ لینگے۔ اب کی نوچندی ہیں یا ہمیں نہ ہونگے یا تم ہی نہ ہو گے۔

---

[1] لڑائی۔ حملہ۔ [2] فرشتہ۔ [3] نفرت اور حقارت کے معنوں میں بولتے ہیں۔

آزاد۔ اچھا تم لیس[1] رہنا۔ میں دو گھڑی دن رہے آؤنگا۔ گھبراؤ نہیں۔ تمہارا بال بیکا ہو تو مونچھ مُنڈا ڈالوں۔ یہ دو سو آدمی دیکھنے ہی بھر کے ہونگے۔ جانباز ان میں دو چار ہی ہونگے جو آزاد کی تیغ کی چمک اور آبِ خنجر کی جھلک کا سامنا کریں ورنہ ایک سو چھیا لوے نوک دم بھاگیں تو سہی۔ اجل کا مقابلہ کرنا دل لگی نہیں ہے مرد میدان[2] باید۔ لے بس اب رخصت کل ملیں گے۔

میاں آزاد دوسرے دن ہتھیار باندھ کر اوچی بنے ہوئے چلے۔ راستے میں وہی بانکے ملے۔ علیک سلیک کے بعد دونوں ساتھ ساتھ چلے جھٹپٹے وقت ٹہلتے ہوئے درگاہ پہنچے۔

نوچندی جمعرات جس کے آگے بنارس کا بوڑھوا منگل[3] مات، چو طرفہ چہل پہل۔ تماشائیوں کا ہجوم، ہٹو بچو کی دھوم۔ ٹھٹ پر ٹھٹ لگے ہیں، آدمی پر آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ میوہ فروش صدا لگا رہے ہیں۔ تنبولی بیڑے بنا رہے ہیں۔ گنڈیریاں ہیں کیوڑے کی۔ کلیجے ہیں کباب۔ میاں آزاد خراماں خراماں سیر کرتے پھاٹک پر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ سامنے تیس چالیس کا غول ہے۔ بانکے نے کان میں کہا۔ یہی حضرات ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ دنگے پر آمادہ ہیں یا نہیں اور لطف یہ کہ کوئی نہتّا[4] نہیں

---

[1] تیار۔ [2] بہادر چاہیئے جو مقابلہ کرے۔ [3] بنارس کے ایک میلے کا نام جو منگل کے دن لگتا ہے۔ [4] بغیر ہتھیار کے۔

آزاد۔ بھلا یہاں تمہارا ابھی کوئی جان پہچان ہے۔ ہو تو دس پانچ کو تم بھی بُلا لو۔ بھیڑ بھڑکا[1] تو ہو جائے۔ لڑنے والے ہم کیا کم ہیں۔ بانکے۔ ابھی لایا۔ دس بیس اچھے جیوٹ[2] آدمی کٹ مرنے والے۔ آپ بیٹھیں، میں دم کے دم میں آیا۔ مگر باہر ٹہلئے تو اچھا ہے یہاں جوکھم[3] ہے۔

میاں آزاد پھاٹک کے باہر ٹہلنے لگے اور ان کے یار چے[4] چلے جیوٹ آدمیوں کی تلاش میں۔ کیدان نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو باہم ہنڈیاں پکنے لگیں[5]۔ وہ بھگایا، وہ ہٹایا۔ بھاگا ہے نوک دُم،..... ہات تری دُم میں نمدا۔ ایک شخص نے کہا حضور وہ بھاگا نہیں ہے واللہ ایک ہی کائیاں[6] ہے۔ کسی فکر میں گیا ہے۔ ذری کسی آدمی کو دوڑا دیجئے تو خبر لائے۔ ایک بگڑے دل باہر گئے تو دیکھا پچھم کی طرف شتر بے مہار[7] کی طرح گردن اٹھائے چلے جاتے ہیں اور میاں آزاد پھاٹک سے دس قدم پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اُلٹے پاؤں آکر خبر دی کہ واللہ بس یہی موقع ہے۔ چلئے چلئے مار لیا ہے اناڑی کو۔ بائیں ہاتھ چلا جاتا ہے۔ اور اکیلا ہے یک بینی و دو گوش[8]۔ تلوار آزاد کے پاس ہے۔ وہ سب دوسرے پھاٹک سے بھربھرا کر چڑھ دوڑے۔ ٹھہر بے ٹھہر۔ ادھر اُدھر بس

---

[1] بہادر۔ [2] خطرہ۔ [3] یار سے اسم تصغیر۔ [4] چپکے چپکے باتیں کرنا۔ [5] ہوشیار۔ [6] منہ اٹھائے بغیر نکیل کے اونٹ کی طرح۔ [7] ایک ناک اور دو کانوں کے ساتھ یعنی بالکل اکیلا

رُک جا۔ آگے قدم بڑھایا اور تلوار کا زخم کھایا۔ جنبش کی اور دیا تُلا ہوا ہاتھ۔ بچہ آج نوچندی جمعرات ہے۔"

پندرہ بیس آدمیوں نے چوطرفہ سے گھیر لیا اور لگا گالیوں کا چھرا[1] چلنے۔ کمیدان کی آنکھیں لال انگارا۔ خون ٹپک رہا تھا۔ بدن مارے غصے کے تھرتھرا رہا تھا۔ بانکے کو اکیلا پاکر رفقا[2] بھی شیر ہیں۔ کوئی اکڑتا ہے، کوئی بڑا تا ہے۔ اتنے میں دس پانچ لے مشیخت[3] میں آکر تلوار کھینچ ہی تو لی۔ ہائیں ہائیں اور لوگوں نے دیکھا کہ ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں۔ سرسے سروہی میان سے باہر تھی۔ بانکے کا رنگ فق کہ غضب ہی ہو گیا۔ اب کتے کی موت مرے۔ کس کس سے لڑونگا۔ ایک کی دوا دو نہ کہ سو۔ خیر۔ پھر ہرچہ بادا باد[4]۔ بیچارے میاں آزاد کو کوئی خبر کر دیتا تو وہ جھپٹ ہی پڑتے۔ مگر اب موقع کجا جب تک کوئی جائے جائے ہمارا کام تمام ہو جائیگا۔ ایک یار نے بڑھکر بانکے بے چارے مصیبت کے مارے پر ایک لٹھ لگا دیا تو بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس میں غُل غپاڑے کی آواز میاں آزاد نے بھی سُنی۔ انھیں کیا معلوم کہ ان کے یار پر کیا وقت گذر رہا ہے۔ ٹہلتے ہوئے چلے اور بھیڑ کاٹ کر دراتے[5] ہوئے پہنچے۔ اہو ہو ہو۔ یہ بانکے یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! ہم ٹہلتے ہی رہ گئے اور حریف جھانسا[6] دے ہی گیا۔ تلوار کو ذرا ٹیکا اور زن سے

---

[1] بوچھار۔ [2] ساتھی۔ [3] شیخی۔ [4] جو ہو سو ہو۔ [5] شان سے اکڑ کر۔ [6] دھوکہ۔

اُس پار آن پہنچے۔ بھئی کھلاڑی، خبردار اناڑی۔ ہاتھ اٹھایا اور ریں نے چیر غٹو کیا۔ اور ٹیٹو الیا۔ بانکے کے دل میں ڈھارس ہوئی کہ شکر ہے خداوندا جان بچائی۔ از سرِ نو زندگی پائی۔ اتنے میں میاں آزاد نے کہاروکو اور سہ

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغ شرر فشاں — شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ جہاں — دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں

تلوار کا چمکنا تھا کہ سب ساتھی رفیق نام کے بانکے ہُرّ ہو گئے۔ میدان خالی فقط میاں آزاد اور بانکے ایک طرف کمیدان اور دو شریف زادے دوسری طرف۔ باقی رفوچکر۔ ایک نے آزاد پر تینچہ چلایا۔ دائیں۔ مگر خالی گیا۔ پھر کل پر چڑھایا اور داغا مگر رنجک چاٹ گئی۔ آزاد نے جھپٹ کر اُن کو تو ایسا چرکا دیا کہ تلملا کر گر پڑے۔ دوسرے حضرت دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بانکے شک گئے۔ اب میاں آزاد اور کمیدان آدھ گھنٹے تک اِن کے اُن کے شپا شپ تلوار چلا کی۔ آخر کار اُنہوں نے بڑھ کر جنیو کا وہ کافر ہاتھ لگایا کہ پھندارہ تک کھل گیا۔ مگر کمیدان بھی گرتے گرتے باہرہ دے ہی گیا۔ طرفین سے خون کے شرّاٹے بہنے لگے ادھر یہ اُدھر وہ دھم سے گرے انہوں نے کہا یا علی۔ وہ پکارے الا اللہ۔

(از فسانہ آزاد جلد اوّل)

لے بھاگ گئے۔ کے چل نہیں سکا۔ کے کھسک گئے۔ کے بھرپور ہاتھ۔ جنیو کا ہاتھ ایک داؤ کا نام۔ کے سر۔

۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی لکھنؤ میں پائی
مگر سات آٹھ برس کے سن میں اُن کے والد نے کلکتہ بُلوا لیا۔ جہاں ان
کے نانا واجد علی شاہ اودھ کی معیّت میں بعزم انگلستان آئے تھے۔
کلکتہ میں اُن کی تربیت شاہ اودھ کے زیرِ سایہ ہوئی اور وہیں مُلا باقر
سے عربی پڑھی۔ پھر لکھنؤ آکر علمائے فرنگی محل کے سامنے زانوئے
ادب تہ کیا۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی استعداد حاصل کی۔

۱۸۸۱ء میں اودھ اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے
اسی زمانے میں "محشر" نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جس میں شاعرانہ
مذاق کے رنگین اور نازک مضامین شایع ہوتے تھے۔ جنوری ۱۸۸۷ء
میں "دلگداز" جاری کیا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ایک دلچسپ
ناول بھی لکھا جسے سب نے پسند کیا۔

۱۸۹۱ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور نواب وقارالامرا کی
سرپرستی میں تاریخ سندھ لکھی جس کے صلہ میں پانچ ہزار روپے ریاست سے

ملے ۱۸۹۳ء میں نواب وقار الامرا کے صاحبزادے کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے جہاں ڈیڑھ سال کے عرصۂ قیام میں فرانسیسی زبان پر اسقدر عبور حاصل کرلیا کہ فرنچ سے اُردو میں بآسانی ترجمہ کر سکتے تھے۔

انگلستان سے واپسی پر لکھنؤ میں مستقل قیام فرمایا اور علمی خدمات میں منہمک رہے۔ ۱۹۰۱ء میں پھر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۰۹ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوکر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں بمقام لکھنؤ رحلت فرمائی۔

نثر میں شاعرانہ خیالات کا ادا کرنا۔ تاریخی اور عشقیہ ناولوں کو دلچسپ پیرایہ میں لکھنا۔ تاریخی واقعات کی تحقیق، قدرتی مناظر اور دلی جذبات کی نثر میں ترجمانی شرر کی امتیازی خصوصیات ہیں جن میں کوئی اُن کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ اُردو زبان میں شرر بہترین ناول نویس تسلیم کئے گئے ہیں اور یہ حق بھی ہے۔ ان کی تصانیف بہت زیادہ ہیں جن میں ناولوں کے علاوہ تاریخ سندھ۔ عصرِ قدیم اور مضامین کے متعدد مجموعے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کا ایک مسافر

یہ عجیب و غریب مسافر ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم المعروف بہ ابن بطوطہ ہے لیکن ممالک مشرق کے لوگ اسے شمس الدین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ شخص ملک مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا تھا۔ مراکش جسے اب انگریزی میں مراکو کہتے ہیں۔ افریقہ کے انتہائی حدود پر واقع ہے۔ وہ مشہور آبنائے جسے جبرالٹر کہتے ہیں۔ جو شرقاً اور غرباً بحیرۂ روم کو بحر اعظم مغرب یعنی اٹلانٹک اوشن سے ملاتی ہے اور شمالاً و جنوباً یوروپ کو افریقہ کے پاس پہنچاتی ہے۔ اس کے جنوبی ساحل سے مراغہ کی سرزمین شروع ہوتی ہے اور شمالی ساحل پر اسپین یعنی قدیم اندلوسیہ کی سرزمین ہے۔ دونوں ساحلوں پر ایک دوسرے کے مقابل ڈو شہر آباد ہیں۔ یوروپین یعنی شمالی ساحل پر شہر جبرالٹر واقع ہے جواب تو جبرالٹر ہے مگر کسی زمانے میں جبل الطارق تھا اور جنوبی ساحل یعنی مراکش کی سرزمین پر ایک آباد و قدیم شہر ہے جس کو انگریزی میں ٹینجیر اور عربی میں طنجہ کہتے ہیں۔ یہی شہر طنجہ جو پرانی دنیا کی آخری حد پر واقع ہے۔ ابن بطوطہ کا مولد ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ

میں نے صرف بہ نیتِ حج بیت الحرام اور زیارت تربت رسول علیہ السلام جمعرات کے روز ۲ رجب ۷۲۵ھ ہجری کو اپنے پیارے وطن طنجہ کو چھوڑا۔ اعزا اور اقربا میں ہر زن و مرد کی مفارقت اپنے اوپر گوارا کر لی اور اس طرح وطن سے نکلا جس طرح چڑیا اپنے آشیانے سے اُڑ جاتی ہے۔ میرا سن اسوقت بائیس برس کا تھا اور ماں باپ بقیدِ حیات تھے جنہوں نے نہایت دلسوزی سے آنسو بہا بہا کے اور کلیجے پر صبر کی سلیں رکھ رکھ کے مجھے رخصت کیا۔ میں نے اُن کی مفارقت کا داغ سینے میں لیا اور وطن کو خیرباد کہی۔

ابن بطوطہ کا سفر معمولی حاجیوں کا سفر نہ تھا۔ یہ اولوالعزم مسافر جو جو ملک راستے میں پڑے اُن کو بخوبی دیکھتا بھالتا ہر شہر کی معزز سوسائٹیوں کو پرکھتا اور گاؤں گاؤں پھرتا۔ یا یوں کہئے کہ ہر روز نیا دانہ کھاتا اور نیا پانی پیتا روانہ ہوا۔ الجیریا۔ ٹونس۔ طرابلس اور برقا کے مرغزاروں کی ہوا کھاتا ہوا مصر میں پہنچا۔ مصر میں مدت تک شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کے سرزمین شام میں پہنچا۔ شام میں بیت المقدس اور تمام مقامات کا سفر کرتا ہوا ایشیائے کوچک میں داخل ہوا۔ اس ملک کے جنوبی اضلاع کی سیر سے خوب سیر ہو کر کوہ لبنان اور بعلبک ہوتا ہوا شہر دمشق میں آیا۔ دمشق کا حال اس نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ سردست ہم اجمالی طور پر ابن بطوطہ کے

سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔

دمشق سے نکل کر ابن بطوطہ ارضِ عرب سے برکتیں حاصل کرتا ہوا مدینۂ طیبۂ حضرت رسول علیہ السلام میں آیا۔ وہاں سے مکہ میں جا کر شریکِ حج ہوا۔ ابنِ بطوطہ کے دل میں بچپن سے سفر کا شوق تھا۔ پہلے تو صرف حج اور زیارت روضۂ رسول علیہ السلام کی نیت تھی مگر اب خیالات ایسے وسیع ہوئے کہ ساری دنیا کے سفر پر آمادہ ہو گیا اور مکہ معظمہ سے خشکی کے راستے عراق عرب میں آیا۔ وہاں کے تمام شہروں میں ہوتا ہوا ایران میں پہنچا۔ ایران میں خوب پھر پھرا کے اور تمام مشہور شہروں کی سیر کر کے پھر عرب میں واپس آیا اور عدن سے جہاز پر سوار ہو کے جنوبی سواحل افریقہ کے شہروں کی طرف روانہ ہوا۔ زنجبار ہوتا ہوا، میڈے گاسکر کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد سواحلِ عرب یمن اور عمان پر ٹھہرتا ہوا گذرا۔ اور خلیج فارس کی طرف سے چڑھ کے ملک ایشائے کوچک کی سیر میں مشغول ہوا۔ عرضاً پورا ملک قطع کر کے بحرِ اسود کے سواحل پر گیا۔ پھر بلغاریہ ہوتا ہوا قسطنطنیہ میں گیا۔ قسطنطنیہ اسوقت مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔ ایک مہینے سے زاید وہاں ٹھہر کر براہِ خشکی سیدھا مشرق کی طرف چلا۔ ماورالنہر و ایران ہوتا ہوا اور ہر ہر مقام کی سیر کرتا ہوا کابل اور قندھار پہنچا۔ اس کے بعد اُس نے ہندوستان کا

سہ ملک۔ زمین۔ سہ پاک۔

سفر کیا۔ پنجاب سے لے کر بنگالے تک اور شمال اور وسطِ ہند کے بہت سے مقامات کے علاوہ سندھ سے راس کماری تک اُس نے ہر ہر شہر کی زیارت کی۔ سراندیپ کے تمام شہروں میں پھر پھرا کے سواحل کرناٹک سے گذرتا ہوا برما میں داخل ہوا۔ برما کی سیر سے خوب سیر ہو کر جاوا اور جزائر چین میں پھرتا رہا۔ پھر خاص چین میں گیا اور وہاں سے واپسی کا قصد کر کے عرب ہوتا ہوا وسطِ افریقہ سے گذرتا ہوا مراکش میں پہنچا۔ وطن میں پہنچ کے ابنِ بطوطہ نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور ایک ایسی عمدہ کتاب اسلامی کتب خانوں کی زیب و زینت کے لئے مرتب کر دی کہ اسوقت تک دنیا اس کی نظیر سے خالی تھی۔

نہیں اسلام ہی کی لائبریری نہیں دنیا کی کُل لائبریریاں اس قسم کی کتاب سے اسوقت تک خالی تھیں اگرچہ اب کچھ تو بوجہ ذرائع سفر میں انتہا سے زیادہ سہولت پیدا ہو جانے کے اور کچھ بباعث عام ذوق سفر بڑھ جانے کے یورپین لوگوں کے سفر زیادہ وسیع معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ابنِ بطوطہ کے سفرنامے کی وقعت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ اول تو قدیمی طور سے قطع منازل کرنے اور ہر ہر گاؤں میں اپنے اختیار کے موافق قیام کرنے سے جو کچھ تجربہ اور جو لطف سفر ایک قدیم مسافر کو حاصل ہو سکتا تھا وہ آب ان دنوں کے کسی مسافر کو ریلوے ٹرین اور ڈاک کے جہازوں میں

سفر کرنے کی صورت میں ممکن نہیں۔ اور قطع نظر اس کے سفرنامہ ابن بطوطہ کو اس لئے اور زیادہ ترجیح ہے کہ وہ آج سے پانچسو برس پہلے کے حالات دنیا کا نمونہ دکھاتا ہے جس پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور جس عہد کی تاریخ کا ایک جملہ اگر نیا ہو تو سونے کے مول خریدا جاتا ہے اور موجودہ تمام سفرنامے عام اس سے کہ وہ کسی بادشاہ کے لکھے ہوں یا وزیر کے یا کسی معمولی شائق سفر کے ان سب کے ذریعے سے جو کچھ حالات معلوم ہو سکتے ہیں وہ چودھویں صدی ہجری پر محدود ہیں۔ مگر واقعی ہماری قوم سے جہاں الوالعزمی جاتی رہی ہے وہاں الوالعزمی کے کاموں کی قدر بھی جاتی رہی۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ کہ سفرنامہ ابن بطوطہ کی ایسی کتاب پہلے فرانس والوں نے بہم پہنچائی اور ۱۸۵۸ء میں پہلے پہل معہ فرنچ ترجمے کے پیرس دارالسلطنت فرانس میں طبع ہوئی جس کی نقل اب تقریباً بیس برس ہوئے مصر میں چھپی ہے۔

سلمان اپنے خیال میں سعدی شیرازی کے سفر کو اپنے قومی مسافروں کی الوالعزمی کی انتہا سمجھتے ہیں۔ کبھی ان کے خیال میں بھی نہ آیا ہوگا کہ ابن بطوطہ کے ایسے مسافران کی قوم میں گذر چکے ہیں ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں یہ سب سے بڑا کمال کیا ہے کہ اپنے الہامی انکشاف سے اس نسل کے مذاق کو سمجھ گیا جو چار

پانچسو برس بعد آنے والی تھی۔ دیگر عربی مورخین کی طرح اس نے صرف بادشاہ اور وزیر کی داستانیں نہیں لکھی ہیں بلکہ جس مقام پر پہنچا ہے وہاں کی اخلاقی حالت، ملکی عادت، مذہبی رسوم پر خوب غائر نظر ڈالی ہے۔ اور اسی قسم کے حالات سے اپنے سفرنامے کو مرتب کیا ہے۔ مثلاً جب غرّۂ محرم ۷۳۴ھ ہجری کو پنجاب میں پہنچا اور ان تمام اضلاع میں جن کو دریائے اٹک سیراب کرتا ہوا سواحلِ سندھ کی ہوا کھانے لگا ہے۔ تو اس نے وہاں کے خاندانوں کو خوب غور سے دیکھا۔ اپنے سفرنامے میں اس عربی نسل کا حال لکھا ہے۔ جو بنی اُمیہ کے عہدِ قدیم میں سندھ کے بلاد[۱] میں آکے آباد ہوئی تھی پھر یہ بھی بتایا ہے کہ قدیم عربی اور اسلامی رسوم سے وہ کسقدر ہٹ گئے ہیں اور اب زمین ہند کی آب وہوا نے اُن پر کیا اثر کیا ہے پھر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا اور انتظام ملکی اور ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے اخلاقی حالات سے تجربے کے مختلف سبق لیتا گیا ہے۔ یہاں ہندو عورتوں کے ستی ہونے کی رسم نے اُسے نہایت ہی حیرت اور عبرت میں ڈال دیا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے خود جا کے عورتوں کے ستی ہونے کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ابنِ بطوطہ جسوقت ہندوستان میں آیا ہے اُس وقت

---

[۱] جمع بلد کی بمعنی شہر۔

سلطان محمد شاہ ابن سلطان غیاث الدین تغلق ہندوستان کا فرمانروا تھا۔ اِس موقع پر ابنِ بطوطہ کے بیان سے ایک امر ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی طرف ہمارے عام احباب درکنار اُن لوگوں کا خیال بھی کبھی نہ گیا ہوگا جن کو تاریخ میں بصیرت ہے. وہ یہ کہ دنیائے اسلام جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے مگر اس کے اجزا آج ایسے پریشان نظر آتے ہیں کہ ایک دوسرے کے حالات سے کبھی مطلع بھی نہیں ہوتا۔ اِس عہد میں یہ دنیا یوں بے تعلق نہ تھی حیرت کی بات ہے کہ آج جبکہ دُخانی جہازوں اور ریلوے ٹرینوں نے عالم کے ہر ہر کونے کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے ملک کے مسلمانوں کی خبر بھی نہیں ہوتی ہندوستان میں کون جانتا ہے کہ مراکش میں کیا ہوتا ہے۔ طرابلس والے کیا کر رہے ہیں۔ ٹونس پر کیا مصیبت پڑی ہے۔ الجیرس (جسے عربی میں الجزائر کہتے ہیں) کے مسلمان کس خیال میں ہیں۔ زنجبار والے کیسے ہوتے ہیں اور برما اور چین کے اہلِ اسلام کے خیالات کیا ہیں۔ اور جس طرح ہم لاعلمی کی کوٹھری میں بند ہیں اُسی طرح مذکورۂ بالا مقامات کے لوگ بھی ہمارے حالات سے بیخبر ہونگے۔ مگر یہ کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ پانچسو برس پیشتر کا زمانہ جب نہ یہ دُخانی جہاز تھے نہ یہ ریل تھی اور نہ یہ تاربرقی کا سلسلہ قایم تھا۔ یہ ملک ایسا مہذب تھا کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملکوں کی سیر میں

کرتے تھے اور رشتۂ اُخوت[1] اسلامی کو روز بروز مضبوط کرتے تھے۔

ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص ہندوستان میں غرناطہ اور قرطبہ کے بعض بعض لوگ موجود تھے اور سفر ان کی نظر میں ایک ایسی چیز تھا کہ بے خوف و خطر ہر چہار طرف پھیل جاتے تھے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ جب میں اسکندریہ میں امام برہان الدین اعرج سے ملا جو وہاں کے مشہور اور اہلِ دل آئمہ[2] میں سے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک میرے دل میں سوا حج اور زیارت تربتِ رسولؐ کے اور کسی سفر کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے میری سیاحت پسند طبیعت کا اندازہ کرکے یا اپنے مکاشفے[3] کے علم سے مطلع ہو کر کہا غالباً دور دراز کے ملکوں تک تمہاری رسائی ہو گی اور دنیا کے ہر ہر کونے کی تم سیر کرو گے۔ اگر ایسا ہو تو میرے بھائی فرید الدین کو ہند میں اور میرے بھائی رکن الدین کو سندھ میں اور میرے ہمنام بھائی برہان الدین کو چین میں میرا سلام پہنچا دینا۔ ابن بطوطہ ان تینوں بھائیوں سے ملا ہے بلکہ فرید الدین کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ شہنشاہِ دہلی کے اُستاد تھے اور صلۂ استادی میں ان کو پنجاب کا قدیم مشہور شہر اجودھن جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ میں وہیں اجودھن میں جا کے ان کی ملاقات سے محظوظ ہوا اور لکھتا ہے کہ دمشق کی مشہور اور

[1] سب مسلمان مذہب کے اعتبار سے بھائی بھائی ہیں اس لئے سفر سے اس اسلامی برادری کا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہوتا تھا۔ [2] امام کی جمع۔ [3] کسی کے دل کا بھید جاننا۔

عالی شان مسجد جو جامع بنی اُمیہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہے اس میں
مالکیوں کے امام فقیہ ابو عمر بن ابی الولید بن الحاج التجیبی تھے جن
کا خاندان تو غرناطہ کا تھا مگر پیدا وہ قرطبہ میں ہوئے تھے۔ اور آخر
میں دمشق کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ کہتا ہے کہ میں نے دمشق میں
جن جن علماء سے سند حدیث حاصل کی اُن میں سب سے
زیادہ مستند اور متبحر[1] شہاب الدین احمد معروف بہ ابنِ شحنہ حجازی تھے
ماہِ مبارک رمضان ۷۲۶ھ ہجری میں کتاب صحیح بخاری چودہ جلدوں میں
میں نے ابن شحنہ ممدوح کی زبان سے سُن کر سند حاصل کی اور ابنِ شحنہ
کو مشہور مورخ شام امام حافظ علم الدین ابو محمد قاسم بن محمد بن یوسف
کے تلمذ[2] کا فخر تھا اور حافظ علم الدین ممدوح اسپین کے شہر ابتیلہ کے
رہنے والے تھے جنہوں نے آخر سرزمین شام میں توطن اختیار کیا
اور بے مثل تاریخ شام مرتب کی۔ اس کے علاوہ تربتِ رسول کے
خدام[3] میں اس نے ایسے کئی لوگوں کے نام بتائے ہیں جو غرناطہ
کے رہنے والے تھے اور جن کو سرزمینِ یوروپ نے خدا کے حبیب
خاص پیغمبر عرب کے روضۂ مطہر کی خدمت کے لئے پیش کیا تھا۔

ابن بطوطہ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس سے اُن لوگوں
کے دینی جوش اور نیز بادشاہوں کی قدر دانی کا اندازہ کرنے کے
ساتھ یہ بھی معلوم ہو گا کہ ایک غرناطہ کا رہنے والا شخص کیونکر ہندستان

[1] تجربہ کار۔ [2] شاگردی۔ [3] خادم کی جمع۔ یعنی ملازم۔

میں آیا اور شاہی دربار میں پہنچا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ میرے ہمراہ غرناطہ کا ایک خوش اوقات اور پاک نفس فقیر علی بن حجر زیارت مدینۂ رسول سے شرفیاب ہوا تھا۔ اتفاقاً پہلی ہی شب کو اس نے خواب میں مُنادیِ غیب کی زبان سے دو شعر سُنے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

"یعنی اے رسول پاک کے روضۂ مقدس کی زیارت کرنے والو تمہیں مبارک ہو کہ بہ برکت اُسی رسول کے روزِ جزا کو تم تمام خرابیوں سے امن اور نجات پا گئے۔ تم ارض طیبہ میں روضۂ حبیبِ خدا کی زیارت سے شرفیاب ہوئے۔ مرحبا اس شخص کو جس کی صبح یا شام ارض طیبہ میں ہو۔"

یہ اشعار اس نے صبح کو مجھ سے بیان کئے۔ پھر میں تو دنیا کے اور اطراف میں چلا گیا اور علی بن حجر جوارِ رسول[۱] ہی میں مقیم رہا۔ یہاں تک کہ ۷۴۳ھ ہجری میں جب سرزمین ہند میں پہنچا۔ تو اس نے بھی اتفاقاً ہندوستان کا سفر کیا۔ اور دہلی میں پہنچ کر میرے پڑوس ہی میں اُترا مجھے جب شہنشاہِ ہند کے دربار میں جانے کی عزت حاصل ہوئی تو میں نے بادشاہ سے اس کا حال بیان کیا اور اُن اشعار کو پڑھا۔ بادشاہ نے علی بن حجر سے ملنے کا شوق ظاہر کیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ اسکو دربار میں لاکر حاضر کروں۔ جب علی بن حجر سلطان محمد تغلق کے سامنے آیا تو بادشاہ نے اُس سے فرمائش کی کہ

[۱] رسول کی قبر کے قریب۔

مدینہ طیبہ میں جو خواب دیکھا تھا اس کو اپنی زبان سے بیان کرے اس کی زبان سے یہ اشعار سُن کر سلطان بہت خوش ہوا۔ اور حکم دیا کہ انعام کے طور پر تین سو اشرفیاں اور ایک خاصے کا گھوڑا معہ تمام سامانوں کے اس کو دیا جائے۔ علی بن حجر اسوقت سے ایک عمدہ مکان میں رہنے لگا۔ ان دنوں دہلی میں غرناطہ کا ایک متبحر فقیہ[1] تھا جو جمال الدین مغربی کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کو علی بن حجر نے اپنے مکان کے ایک حصّہ میں اتارا اور وعدہ کیا کہ اپنی بیٹی اس کے عقد میں دیدیگا۔ ایک غلام اور ایک لونڈی مول لی جو ہر وقت اسکی خدمت میں رہا کرتے اور باقی ماندہ اشرفیوں کو ہر لحظہ اپنے سامنے رکھتا تھا کہ کوئی چُرا نہ لے۔ اتفاقاً غلام اور لونڈی کا ہاتھ اشرفیوں تک پہنچ گیا اور لے کر چلدیئے۔ اس نقصان نے علی بن حجر کو ایسا صدمہ دیا کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور بیمار پڑ گیا۔ سلطان کو اس کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ تین سو اشرفیاں پھر دیدی جائیں۔ مگر جب تک یہ خبر پہنچے پہنچے موت علی بن حجر کا کام تمام کر چکی تھی۔ علی بن حجر کے بعد جمال الدین مغربی متوطن غرناطہ دہلی ہی میں رہا۔ بلکہ ایک مقام پر ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان میں آیا تھا پھر یہیں اُس نے شادی کر لی اور صاحب اہل و عیال ہو گیا

ابن بطوطہ نے ہندوستان اور خصوص شہر دہلی اور شاہی

[1] فقیہ یعنی اسلامی شرع اور قانون جاننے والا۔

دربار کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں جن لوگوں نے آجکل تاریخیں لکھی ہیں انہوں نے سلطان محمد تغلق کے حالات پر ایسے ریمارک کئے ہیں کہ ان کی تحریر سے اس بادشاہ میں ہر طرح کے عیوب اور برائیاں ثابت ہوتی ہیں۔ حالانکہ ابن بطوطہ جس نے اس کے دربار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نہایت آزادی سے دعویٰ کرتا ہے کہ اس بادشاہ میں اگرچہ بعض بہت بڑے نقائص تھے۔ مگر اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں جو اس کے پہلے اور بعد دنیا کے کسی شہنشاہ میں نہ ہوئی ہونگی۔

لکھنؤ کے رکاب دار

انسانی معاشرت میں سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے۔ اور کسی گروہ اور کسی قوم کے ترقی کرتے وقت سب سے پہلے شوق اپنی خوش مذاقی اور جدتوں کا اظہار دسترخوان پر کرتا ہے۔ اسی لئے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باورچی خانے اور دسترخوان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا اور کیا کیا جدت طرازیاں کیں اور اس فن میں یہاں کے لوگوں نے کس درجے تک ترقی کی۔

یہ معمول ہے کہ جو کام جس شخص کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ اس میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتا ہے اور اسکا شوقین بن جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں کھانے کے ابتدائی شوقین بھی روسا تسلیم کئے جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ یوں تو اس سرزمین میں کھانے کے شوقین صدہا رئیس پیدا ہو گئے۔ مگر نواب سالار جنگ کے خاندان کو آخر تک الوان نعمت کی ایجاد و ترقی میں خاص شہرت ہوئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود نواب سالار جنگ کا

باورچی جو صرف اُن کے لئے کھانا تیار کیا کرتا تھا بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ جو تنخواہ آج بھی کبھی بڑے سے بڑے ہندوستانی دربار میں کسی باورچی کو نہیں ملتی۔ خاص اُن کے لئے وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا کہ سوا اُن کے اور کوئی ہضم نہ کر سکتا۔ یہانتک کہ ایک دن نواب شجاع الدولہ نے اُن سے کہا "تم نے کبھی ہمیں وہ پلاؤ نہ کھلایا جو خاص اپنے لئے پکوایا کرتے ہو" عرض کیا "بہتر ہے۔ آج حاضر کرونگا" باورچی سے کہا "جتنا پلاؤ روز پکاتے ہو آج اسکا دُونا پکانا" اُس نے کہا "میں تو صرف آپ کے خاصے کے لئے نوکر ہوں کسی اور کے لئے نہیں پکا سکتا" کہا "اسے نواب صاحب نے فرمائش کی ہے ممکن ہے کہ میں اُن کے لئے نہ لے جاؤں" اس نے کہا "کوئی ہو میں تو اور کسی کے لئے نہیں پکا سکتا" جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا "بہتر مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جا کے اپنے سامنے کھلائیں۔ اور چند لقموں سے زیادہ نہ کھانے دیں اور احتیاطاً آبدار خانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لے جائیں۔" سالار جنگ نے یہ شرطیں قبول کیں۔ آخر باورچی نے پلاؤ تیار کیا اور سالار جنگ خود لے گئے پہنچے اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی اور رغبت کے ساتھ کھانے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے بڑھ کے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "بس اس سے زیادہ نہ کھائیے" شجاع الدولہ نے حیرت سے

اُن کی صورت دیکھی اور کہا۔ اِن چار لقموں میں کیا ہوتا ہے۔ اور یہ کہہ کے زبردستی دو ایک لقمے کھا ہی لئے۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آبدار خانے سے جو ساتھ گیا تھا پانی منگوا منگوا کے پلانا شروع کیا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے تشنگی موقوف ہوئی اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔

آجکل کے مذاق میں یہ غذا کی کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی۔ مگر اُس زمانے میں اور پُرانے مذاق کے کھانے والوں کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا اصلی معیار یہی ہے کہ غذائیں بظاہر نفیس و لطیف ہوں مگر اصل میں اسقدر قوی اور معدے پر گراں ہوں کہ معدہ ہرگز برداشت نہ کر سکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتوں میں دکھا کے ایسا بنا دیا جائے کہ دسترخوان پر ظاہر میں تو یہ نظر آئے کہ بیسوں قسم کے الوان نعمت موجود ہیں مگر چکھئے اور غور کیجئے تو وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ مثلاً معتبر ذرائع سے سنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہزادوں میں سے مرزا آسماں قدر فرزند مرزا خُرم بخت جو لکھنؤ میں آ کے شیعہ ہوئے اور چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد بنارس میں جا کے قیام پذیر ہو گئے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اُن کی دعوت کی تو دسترخوان پر ایک مربہ لا کے رکھا گیا جو صورت میں نہایت ہی نفیس و لطیف اور مرغوب ہوتا تھا۔ مرزا آسماں قدر نے اُس کو

کھایا تو چکرائے۔ اس لئے کہ وہ مربّہ نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا جس کی صورت رکابدار نے بعینہ مربّے کی سی بنا دی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر انھیں ندامت ہوئی اور واجد علی شاہ خوش ہوئے کہ دہلی کے ایک معزز شاہزادے کو دھوکا دیدیا۔

دوچار روز بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی اور واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائیگا۔ مگر اس ہوشیاری پر بھی دھوکہ کھا گئے۔ اس لئے آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دسترخوان پر صدہا الوانِ نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ پلاؤ تھا زردہ تھا۔ بریانی تھی۔ قورمہ تھا۔ کباب تھے۔ ترکاریاں تھیں چٹنیاں تھیں اچار تھے۔ روٹیاں تھیں۔ پراٹھے تھے۔ شیرمالیں تھیں غرضیکہ ہمہ نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا۔ چانول تھے تو شکر کے۔ اچار تھا تو شکر کا اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہانتک کہ کہتے ہیں کہ تمام برتن، دسترخوان اور سلفچی، آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکے کھا رہے تھے۔

ہمارے دوست نواب محمد شفیع خاں صاحب بہادر نیشاپوری کا بیان ہے کہ ان کے نانا نواب آغا علی حسن خانصاحب کے گھر سے جو نیشاپوریوں میں سب سے زیادہ نامور اور ممتاز تھے بادشاہ گے

لئے روغنی روٹی اور میٹھا گھی جایا کرتا تھا۔ روغنی روٹیاں اسقدر باریک اور نفاست سے پکائی جاتیں کہ موٹے کاغذ سے زیادہ گندہ نہ ہوتیں اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چتیاں پڑیں اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر کچی رہ جائیں۔ میٹھا گھی بھی ایک خاص چیز تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا۔

دہلی میں بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنو کی نفاست نے پلاؤ کو اس پر ترجیح دی۔ عوام کی نظر میں دونوں قریب قریب بلکہ ایک ہی ہیں۔ مگر بریانی میں مسالے کی زیادتی سے سالن ملے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور پلاؤ میں اتنی لطافت نفاست اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریانی اس کے سامنے ملغوبہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معمولی قسم کے پلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پلاؤ خشکہ معلوم ہوتا ہے جو عیب بریانی میں نہیں ہوتا۔ مگر اعلیٰ درجے کے پلاؤ کے مقابل بریانی نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بہت ہی لدھڑ اور بدنما غذا ہے۔ بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ میں پلاؤ کو زیادہ مروّج بنا دیا۔

پلاؤ یہاں کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہیں۔ اُن میں سے بھی صرف گلزار پلاؤ۔ نور پلاؤ۔ کوکو پلاؤ۔ موتی پلاؤ اور چنبیلی پلاؤ کے نام ہمیں یاد ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ درجے کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے محمد علی شاہ

کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس میں خود فرمانروائے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے اُس دعوت میں دسترخوان پر نمکین اور میٹھے کُل ستر قسم کے چاول تھے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں نواب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے نواب حسین علی خاں۔ انھیں کھانے کا بڑا شوق تھا خصوصاً پلاؤ کا۔ ان کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے اور وہ ایسی نفاست اور لطف کے ساتھ تیار کئے جاتے کہ شہر بھر میں اُن کی شہرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ روسا و عمائد میں سے کوئی اُن کے مقابلے کی جراءت نہ کر سکتا۔ خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا اور کھانے کے شوقینوں میں وہ چاول والے مشہور ہو گئے تھے۔

نصیرالدین حیدر کے عہد میں باہر کا ایک باورچی آیا جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا۔ پستے کی دال تیار کرتا اور اِس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ نفیس اور بھریری ماش کی کھچڑی ہے۔ مگر کھائیے تو اور ہی لذت تھی۔ اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک صاحبِ کمال

باورچی صرف چاولوں کی گلتھی پکاتا۔ مگر ایسی گلتھی جو شاہی دسترخوان کی رونق۔ فرمانروائے وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی۔ اور شہر کے تمام رئیسوں کو اُسکا ایک لقمہ مل جانے کی تمنا تھی۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا۔ پوچھا گیا "کیا پکاتے ہو"۔ کہا "صرف ماش کی دال پکاتا ہوں"۔ پوچھا "تنخواہ کیا لوگے"۔ کہا "پانسو روپیہ"۔ نواب نے نوکر رکھ لیا۔ مگر اس نے کہا "میں چند شرطوں پر نوکری کرونگا"۔ پوچھا "وہ شرطیں کیا ہیں"۔ کہا "جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے۔ اور جب اطلاع دوں کہ تیار ہے تو حضور اُسی وقت تناول فرمائیں" نواب نے یہ شرطیں بھی منظور کرلیں۔ چند ماہ کے بعد اُسے دال پکانے کا حکم ہوا اُس نے تیار کی اور نواب کو خبر کی۔ اُنہوں نے کہا "اچھا دسترخوان بچھاؤ۔ میں آتا ہوں"۔ دسترخوان بچھا مگر نواب باتوں میں لگے رہے۔ اُس نے جا کے پھر اطلاع دی کہ "خاصہ تیار ہے"۔ نواب کو پھر آنے میں دیر ہوئی۔ اُس نے سہ بارہ خبر کی۔ اور اس پر بھی نواب صاحب نہ آئے تو اس نے دال کی ہانڈی اٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی جڑ میں اُنڈیل دی اور استعفے دے کے چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈوایا مگر اس کا پتہ نہ لگا۔ مگر چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ سرسبز ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اِس واقعے میں مبالغہ ہے۔

جس نے ایسے خلافِ قیاس ہونے کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ البتہ ہو جاتا ہے کہ دربار میں باورچیوں کی کس درجہ قدر ہوتی تھی۔ اور کوئی صاحب کمال باورچی آجاتا تو کس فیاضی سے روک لیا جاتا۔

امیروں کا یہ ذوق و شوق دیکھ کے باورچیوں نے بھی طرح طرح کی جدت طرازیاں شروع کر دیں۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا اُس میں ہر چاول آدھا یاقوت کی طرح سُرخ اور جلا دار ہوتا اور آدھا سفید۔ مگر اُس میں بھی شیشے کی سی چمک موجود ہوتی جب دسترخوان پر لا کے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ میں ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اور باورچی نے نورتن پلاؤ پکا کے پیش کیا جس میں نورتن کے مشہور جواہرات کے مثل نو رنگ کے چاول ملا دئیے اور پھر رنگوں کی صفائی اور آب و تاب عجیب نفاست اور لطف پیدا کر رہی تھی۔ اسی طرح کی خدا جانے کتنی ایجادیں ہو گئیں جو تمام گھروں اور باورچی خانوں میں پھیل گئیں

کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہیں۔ پہلے دیگ شو۔ جن کا کام دیگوں کا دھونا اور باورچیوں کی ماتحتی میں مزدوری کرنا ہے دوسرے باورچی۔ یہ لوگ کھانا پکاتے ہیں اور اکثر بڑی بڑی دیگیں تیار کر کے اتارتے ہیں۔ تیسرے رکابدار۔ یہی لوگ اس فن کے

اعلیٰ درجے کے ماہر اور صاحبِ کمال ہوتے ہیں۔ یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں اور بڑی دیگیں اتارنا اپنی شان اور مرتبے سے ادنیٰ کام خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ اکثر باورچی بھی چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں۔ مگر رکابداروں کا کام فقط چھوٹی ہانڈیوں تک محدود تھا۔ یہ لوگ میوہ جات کے پھول کترنے۔ کھانا لگانے اور لگانے میں سلیقہ۔ نفاست اور تکلف ظاہر کرتے ہیں۔ چوبوں اور قابوں میں جو پلاؤ یا زردہ نکالا جاتا اُس پر میوہ جات اور دیگر طریقوں سے گل کاریاں کرتے۔ نقش ونگار بناتے۔ نہایت نفیس اور لطیف مربے اور آچار تیار کرتے اور کھانوں میں اپنی طبیعت داری سے صدہا قسم کی صنعتیں دکھاتے۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہ اودھ کو پراٹھے پسند تھے۔ اُن کا رکابدار ہر روز چھ پراٹھے پکاتا اور فی پراٹھا پانچ سیر کے حساب سے تیس سیر گھی روز لیا کرتا۔ ایک دن وزیرِ سلطنت معتمد الدولہ آغا میر نے شاہی رکابدار کو بلا کے پوچھا "ارے بھئی یہ تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟" کہا "پراٹھے پکاتا ہوں!" کہا۔ "بھلا میرے سامنے تو پکاؤ۔" اُس نے کہا "بہت خوب"۔ پراٹھے پکائے۔ جتنا گھی کھپا کھپایا اور باقی بچا پھینک دیا۔ معتمد الدولہ آغا میر نے یہ دیکھ کے حیرت اور استعجاب سے کہا "پورا گھی تو خرچ نہیں ہوا" اس نے کہا "اب یہ گھی تو بالکل تیل ہو گیا

اِس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے میں لگا یا جائے۔ وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دے دیا کہ "آئندہ سے صرف پانچ سیر گھی دیا جایا کرے فی پراٹھا ایک سیر بہت ہے۔" رکابدار نے کہا "بہتر میں اتنے ہی گھی میں پکا دیا کرونگا۔" مگر وزیر کی روک ٹوک سے اسقدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پراٹھے پکا کے بادشاہ کے خاصے پر بھیجدئے۔ جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ "یہ پراٹھے اب کیسے آتے ہیں۔" رکابدار نے عرض کیا "حضور جیسے پراٹھے نواب معتمد الدولہ بہادر کا حکم ہے پکاتا ہوں۔" بادشاہ نے اس کی حقیقت پوچھی تو اس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً معتمد الدولہ کی یاد ہوئی۔ انہوں نے عرض کیا "جہاں پناہ یہ لوگ خواہ مخواہ کو لوٹتے ہیں۔" بادشاہ نے اس کے جواب میں دس پانچ تھپیڑ اور گھونسے رسید کئے۔ خوب ٹھونکا اور کہا "تم نہیں لوٹتے ہو۔ تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لوٹے لیتے ہو اس کا خیال نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لئے یہ تمہیں نہیں گوارہ ہے۔" بہرحال معتمد الدولہ نے توبہ کی۔ کان امیٹھے تو خلعت ہوا جو اس بات کی نشانی تصور کی جاتی کہ آج جہاں پناہ نے دست شفقت پھیرا ہے اور اپنے گھر آئے۔ پھر انہوں نے کبھی اُس رکابدار سے تعرض نہ کیا اور وہ اسی طرح تیس سیر گھی روز لیتا رہا۔

آخر زمانے میں اور غدر کے بعد لکھنؤ میں حکیم بندہ مہدی مرحوم کو کھانے اور پہننے کا بیحد شوق تھا اور بڑے بڑے دولت مند اور شوقین لوگوں کو یقین ہے کہ جیسا کھانا انہوں نے کھایا اور جیسا کپڑا انہوں نے پہنا اُس زمانے میں بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا ہمارے ایک معمّر و معزّز دوست فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط و ضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے ہمارے والد اور چچا کو بُلا بھیجا کہ ایک پہلوان کی دعوت ہے آپ بھی آ کے لطف دیکھئے۔ والد تشریف لے گئے اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا ہے۔ اس پر ڈھائی تین سیر میوہ یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے۔ اور دوپہر اور شام کو ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں اور ایک متوسط درجے کا بکرا کھا جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب اسکا تن و توش بھی تھا۔ وہ ناشتے کے لئے بیتاب تھا اور بار بار تقاضہ کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے۔ مگر حکیم صاحب جان بُوجھ کے ٹال رہے تھے یہانتک کہ بھوک کی شدت نے اُسے بیتاب کر دیا اور اب وہ ناراض ہو کے اُٹھنے لگا۔ تب حکیم صاحب کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر اور ٹالا اور جب دیکھا کہ اب وہ بھوک کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا تو مہری کے ہاتھ ایک خوان بھیجا جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب کی

جان میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک چھوٹی طشتری میں تھوڑا سا پلاؤ تھا۔ جس کی مقدار چھٹانک بھر سے زیادہ نہ ہو گی۔ پُر خور جوان کو یہ چاول دیکھ کے بڑا طیش آیا۔ جو اُس کے ایک لقمے کے لئے بھی کافی نہ تھے۔ قصد کیا کہ اُٹھ کے چلا جائے مگر لوگوں نے سمجھا بجھا کے روکا۔ اور اس نے مجبوراً وہ طشتری اٹھا کے مُنہ میں اُنڈیل لی۔ اور بغیر مُنہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اُس نے پانی مانگا اور اُس کے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے کھانے کے خوان آئے۔ دستر خوان بچھا۔ خود حکیم صاحب بھی آئے کھانا چنا گیا۔ اور وہی پلاؤ جس میں سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا اُسکی پلیٹ جس میں کوئی ڈیڑھ پاؤ چاول ہونگے۔ حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے اُس پلیٹ کو اُس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا دیکھئے یہ وہی پلاؤ ہے یا کوئی اور؟ اور اُس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا: "اب کھائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی تیاری میں دیر ہوئی۔ اور آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی"۔ پہلوان نے کہا: "مگر اب مجھے معاف فرمائیے۔ میں اُسی پہلے لقمے سے سیر ہو گیا۔ اور اب ایک چاول بھی نہیں کھا سکتا"۔ ہزار اصرار کیا گیا مگر اُس نے ہاتھ روک لیا۔ اور کہا: "کھاؤں کیونکر؟ جب پیٹ میں جگہ بھی ہو"۔ حکیم صاحب نے وہ چاول لے کے سب کھا لئے اور اُس سے کہا: "بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھانا انسان کی

غذا نہیں۔ یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوئی۔ انسان کی غذا یہ ہے کہ چند لقمے کھائے مگر اُن سے قوت و توانائی وہ آئے جو بیس بیس سیر غلہ کھانے میں بھی نہ آسکے۔ آپ اس ایک لقمے میں سیر ہو گئے ------ کل پھر آپ کی دعوت ہے۔ کل آ کے بتائیگا کہ اس ایک لقمے سے آپ کو ویسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ بیس سیر دودھ سیروں میوے اور گوشت اور غلے سے حاصل ہوتی تھی یا اس سے کم"۔ اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کر دیا۔ دوسرے دن اس پہلوان نے آ کے بیان کیا کہ "مجھے زندگی بھر ایسی توانائی اور چونچالی نہیں نصیب ہوئی تھی جیسی کہ کل سے آجتک رہی"۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں محمدو نام ایک ولائتی شخص نے آ کے فرنگی محل میں باورچی کی دوکان کھولی اور اس کی نہاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شاہزادے تک اُس کی نہاری کی قدر کرتے۔ قدردانی نے اُسکا حوصلہ بڑھایا اور اس نے شیرمال ایجاد کی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایۂ ناز ہے۔ روٹیوں کی بہت سی قسمیں مشہور اور مختلف شہروں میں مروّج ہیں۔ ایران سے مسلمان خمیری روٹیاں کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین میں تنور گاڑتے ہوئے آئے تھے۔ مگر اُسوقت تک سادی روٹیاں تھیں جن میں گھی کا لگاؤ نہ ہوتا ہندوؤں کو پوریاں تلتے دیکھ کے مسلمانوں نے توے کی روٹیوں

میں گھی کا جزو دے کے پراٹھے ایجاد کئے۔ اور پھر اُن میں متعدد تہیں اور تہیں دینا شروع کیں۔ پھر اُسی پراٹھے میں پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقرخانی کا رواج ہوا جو ابتداءً امرا کے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی۔ لکھنؤ میں محمدو نے باقرخانی پر بہت ترقی دے کر شیرمال پکائی۔ جو مزے بو باس۔ نفاست اور لطافت میں باقرخانی اور تکلفی روٹیوں کے تمام اصناف سے بڑھ گئی۔ شیرمال آج تک سوا لکھنؤ کے اور کہیں نہیں پکتی اور پکتی بھی ہے تو ایسی نہیں پک سکتی۔ چندہی روز میں شیرمال کو ایسی عام مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نیشنل روٹی قرار پاگئی۔ یہاں تک کہ جس دعوت میں شیرمال نہ ہو وہ مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کی نیشنل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے لہٰذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت انھیں چیزوں میں دکھائی گئی۔ پلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ پھر بھی بعض باتیں باقی رہ گئیں دولتمند اور شوقین امیروں کے لئے مرغ مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کھلا کے تیار کئے جاتے۔ یہاں تک کہ ان کے گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوشبو سرایت کرجاتی اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا۔ پھر اُن کی یخنی نکالی جاتی اور اُس یخنی میں چاول دم دئے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاولوں میں آبدار موتی ملے ہوئے ہیں۔ اُس کے لئے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی

زردی میں خوب حل کئے جاتے۔ پھر اس حل شدہ مرکب کو نرخرے میں بھر کے نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اُسے خفیف سا جوش دے کے چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سوڈول آبدار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دئے جاتے۔ بعض رکابدار پنیر کے موتی بناتے اور اُس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ بہر حال ایسی ایسی جدتیں عمل میں آتیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہوتیں۔ بعض رکابداروں نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے اور خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ میں بٹھا دیں۔ چاولوں کی صورت دانے کی کر دی اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چگ رہی ہیں۔ پھولے ہوئے سموسے جن میں سے توڑتے ہی لال نکل کے اُڑ جاتے۔ حیدرآباد دکن میں غالباً لکھنؤ کے رکابدار پیر علی نے آکر تیار کئے جو سرکاری ڈنروں میں میز پر آئے اور معزز مہمانوں کو بہت محظوظ کیا۔

میرناصرعلی

میرناصرعلی ۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ میرصاحب کا خاندان پشتہا پشت سے علم وفضل میں یگانہ ومشہور ہے۔ ان کے والد مولوی سید ناصرالدین دہلی کے جلیل القدر عالم مانے جاتے تھے۔ جن کی کتب مذہبی آجتک عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ میرصاحب کی عمر کا ابتدائی حصہ لکھنؤ میں گذرا۔ لیکن بعد میں دہلی تشریف لے آئے یہاں علوم مشرقی کی تحصیل کے بعد قدیم دہلی کالج سے ۱۸۶۷ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک نانپارہ میں ہیڈ ماسٹر رہے ۱۸۶۹ء میں محکمۂ نمک میں ملازمت کر لی۔ جہاں اپنی کارگذاری اور خدمات کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کے عہدۂ جلیلہ تک ترقی کی۔ اور اسی عہدہ سے ۱۹۱۵ء میں بعزت واحترام سبکدوش ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک ریاست پاٹودی میں دیوان رہے ۱۹۱۲ء میں دہلی دربار کے موقع پر فنونِ لطیفہ کے عجائب خانہ کی

ترتیب میں شریک ہوئے اور اس سلسلے میں مرحوم شہنشاہ جارج پنجم کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا۔

میر صاحب کو اوائل عمر سے انشا پردازی کا شوق تھا۔ اور فرماتے تھے کہ پاکیزہ بیانی اور نازک خیالی میں ہماری زبان کسی اور زبان سے ہرگز کم نہیں ہے۔ میر صاحب وقتاً فوقتاً مختلف رسالے نکالتے رہے۔ جن میں تیرھویں صدی۔ زمانہ۔ افسانۂ ایام ناصری۔ اور آخر میں صلائے عام خاص طور پر مشہور ہیں۔ میر صاحب اُردو زبان میں صاحبِ طرز انشا پرداز مانے جاتے ہیں اور ان کے مضامین ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہوئے۔

جون ۱۹۳۳ء میں پچاسی سال کی عمر میں رحلت فرمائی اور دہلی میں دفن ہوئے۔

خیال بمقابلہ زبان

خیال وہ چیز ہے جو ذہن میں آئے اور زبان اس کے اظہار کا طریقہ ہے۔ زبان اچھی ہو تو کیا کہنا۔ اگر اچھی نہ ہو تو بھی اگر خیال اچھا ہے تو اُجڑے گھر کا چراغ ہو جاتا ہے ؎

وہ داغ دیکھ کے بولے دل شکستہ کا
اُجڑ گیا ہے یہ گھر اور چراغ جلتا ہے

ہماری زبان کی نسبت مدت سے یہ شکایت چلی آتی ہے۔ کہ اس میں مشکل مضامین کے ادائے بیان کی گنجائش نہیں۔ صلائے عام نے اگر کچھ نہیں کیا تو اتنا ضرور کر دکھایا کہ مشکل سے مشکل مضمون بھی اس خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں کہ بے تقاضہ پڑھنے کو جی چاہتا ہو ؎

الٰہی کس نے کہا ہے نہ بولنا ہم سے
کہ آج دل کی طرح سے ہے بیقرار زباں
اجازت آپ جو دیں دوڑ کر کلام کرے
کرے نہ جنبش لب کا بھی انتظار زبان

یہ خوبی تو زبان کی سمجھئے جس میں ہر شخص جو اردو جانتا ہے شریک ہے، مگر صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقت علمی سے

خالی ہوں مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم ولیاقت کی ضرورت ہے اس لئے اہلِ علم وکمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے مضمون پیدا کرنے میں جو خونِ جگر کھانا پڑتا ہے اس کے سمجھنے کے لئے دل ودماغ چاہئے اور دل ودماغ بختِ عرفی کی طرح

جہاں بگشتم و درد ا بہ ہیچ شہر و دیار
نہ یافتم کہ فروشند بخت در بازار

ہر گھڑی ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔

یہی وجہ ہے کہ عوام میں اندر سبھا کی غزلیں زیادہ زبان زد دیکھئے گا اور عرفی کے قصید سے کم۔ جو لوگ عوام کی زبان اختیار کریں جلد مشہور ہو جائیں گے۔ خاص کی زبان دیر میں سمجھ میں آئے گی۔

اُردو لٹریچر میں از روے زبان بہت کچھ لکھا گیا مگر اساتذہ کو چھوڑ کر دیکھئے تو اس شاعری میں اب صرف زبان کا لطف رہ گیا ہے نیا مضمون نکالنا شبِ ہجر کا کاٹنا ہے۔ نثر میں فسانۂ عجائب اور اردوئے معلیٰ پڑا ہے اپنے طرز کی خوبیاں ختم ہیں کہ ان سے بہتر کیا کوئی لکھیگا لیکن اُردو کا سارا لٹریچر دیکھ جائیے نیا خیال ذرا مشکل سے ملیگا زبان کی خوبی جیسا کہ میں عرض کر چکا بڑی چیز ہے۔ مگر خیال کی خوبی اس سے بھی اچھی چیز ہے۔ خیال کو کسی حسین سے تشبیہ دیجئے تو زبان محض آرائشِ

ل میں تمام دنیا میں مارا مارا پھرا لیکن مجھے قسمت کسی بازار میں بکتی ہوئی نہیں ملی۔

لباس سے زیادہ نہیں سمجھی جائے گی۔ دنیا کی پاکیزہ زبانوں میں بڑی ضرورت خیال کی سمجھی جاتی ہے اس کے بعد اندازِ بیان کی نظم میں تشبیہ و استعارے میں ہم نے وہ کمال پیدا کیا کہ یہ کمال ہماری زبان کا حصہ ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی پابندیاں ایسی لگا دیں کہ وہی خوبی ہزار بار دکھائی گئی۔ یہانتک کہ دیکھتے دیکھتے ہماری نگاہ میں اجیرن معلوم ہونے لگی۔ علاوہ اس کے نظم میں جب ہم اسقدر دل و دماغ صرف کر بیٹھے تو اب نثر کے لئے کیا رہ گیا۔ یہ میں پہلے کہہ چکا اور پھر کہتا ہوں کہ زبان کی خوبی ہی نہیں ہے کہ اس کا روزمرّہ بے عیب ہو۔ خیال بھی پاکیزہ چاہئے۔ اُردو لٹریچر میں مجھے زبان کی شکایت نہیں شکایت ہے تو خیال کی کہ خیال بہت ہی معمولی ہوتے ہیں۔ لڑائی ہوتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ کے محاوروں پر، یہ فکر نہیں کہ جو کچھ خیال میں ہے یہ بھی زبان سے نکالنے کے لائق ہے یا نہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جو نل سے مشک بھر رہا ہے دوسرے سقّے سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے اُسی زبان میں لال قلعے تک باتیں سنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔

لکھنؤ میں خاص کی زبان اور عوام کی زبان اور ہے جو تکلف سے خالی نہیں۔ مگر خیال میں نہ یہاں کوئی بات دیکھی نہ وہاں۔ ساری فسانہ عجائب دیکھ جائیے یہ نہیں یاد رہتا کہ نیا مضمون کونسا تھا اور ساری

اُردو ئے معلیٰ پڑھ کر یہی یاد رہا کہ میاں تمہارا خط نہیں آیا تم کیسے ہو۔ کیا کر رہے ہو؟ برخلاف اس کے اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔

آئینہ کو ہم حیران باندھتے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے۔ زہرا کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہے کو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اُس کو دیکھ کر کیا کروں گی۔ جوانی کے بعد جو میری صورت ہو گی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی؟ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہو گا یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کمسن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی۔ صغرسنی کی شادی میں از روئے رسم مندر میں پوجا کرنے کے لئے گئی اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی۔ ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

یونان میں رسم تھی کہ لڑکے کے بالغ ہونے تک سر کے

بال نہیں مُنڈائے جاتے تھے۔ مونڈن کے وقت ماں باپ نے سر کے بال درگاہ پر چڑھاتے وقت کہا کہ سیاہ بالوں کے عوض اسے خدا اتنی عمر دے کہ اسکا سر سپید ہوجائے۔

کھیت نے زمیندار سے کہا کہ تجھ سے پہلے میں تیرے باپ کا تھا، اب تیرا ہوں۔ تیرے بعد تیرے بیٹے کا۔ پھر پوتے کا اور پڑپوتے کا۔ تو مجھے اپنا موروثی سمجھتا ہے۔ تیرے بعد بیٹے نے اگر بیچ ڈالا تو دوسرے کا ہوجاؤنگا۔ مگر یہ سب اپنی بے وقوفی سے مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ میں نہ تیرا ہوں نہ کسی کا۔ نصیب کا اور بخت کا زر خرید غلام ہوں۔

جو نعمتیں کہ انسان کے لئے مناسب ہیں۔ مانگے اور بے مانگے خدا دیتا ہے۔ جو ہمارے لئے مضر ہیں مانگے سے بھی نہیں دیتا یہ نہ دینا اس کی عین رحمت ہے۔

انسان اپنی زندگی اس طرح بسر کرے کہ انتظام میں یہ سمجھے گویا کبھی مرنا ہی نہیں اور آرام میں یہ سمجھے کہ کل کی بھی امید نہیں۔

نیکی کے آغاز میں پہاڑ اور گھاٹیاں اور ہزاروں نشیب و فراز ہیں جو نہایت دشوار گذار ہیں۔ مگر ان سے اُترتے ہی آرام کے دروازے تک تمام راستہ صاف ہموار پڑا ہوا ہے کہ آنکھیں بند کئے چلے جائیے

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اُس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اس کی آنکھ کھل گئی

وہاں سے اُٹھ کر بھاگا۔ اس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا ورنہ دب کر مر جاتا۔ آواز آئی کہ ہم نے اس موت سے اس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی تجھے اس تکلیف کی موت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلّاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچّے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں۔ کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اُٹھائیں۔ ادھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی بھلا میرے ساتھ تو کر کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے۔

مجھے اُن پر افسوس نہیں آتا جو مر گئے۔ اُن پر افسوس آتا ہے جو مرنے کے نام سے ڈر رہے ہیں۔

پیری اور شباب! مجھے اپنے اوپر افسوس آتا ہے کہ میں نے شباب کو جاتے اور پیری کو آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

خدا پروردگار کی نعمتیں عجیب و غریب ہیں۔ آسمان اور زمین۔ سورج اور چاند دریا اور پہاڑ جنگل اور ہوا یہ کسی کو دغا نہیں دیتے۔ دغا دیتی ہیں تو

انسان کی آرزوئیں کہ ایک بھی اس کی مرضی کے موافق پوری نہیں ہوتیں
تو مرا۔ پھر تیرا کچھ نہیں۔ جو تیرے پیچھے رہ گئے ان کا سب کچھ ہے
نصیبِ تمنا رخصت میں منزل پر پہنچ گیا تم نے مجھے بہت بہکایا
میں تمہارے پیچھے پھرتے پھرتے تھک گیا اور اب اوروں کی باری ہے،
اوروں کو دامِ فریب میں لاؤ۔

یہ چند خیال میں نے اہلِ علم کی طبع آزمائی کے لئے جمع کر دیئے
کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں
عاری ہوں۔ شعرائے اُردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف
دوبالا ہو جائے۔ میں نے بُری بھلی اُردو میں اُن کا مطلب ادا کر دیا
آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں۔

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

عالمِ خیال میں ایک شخص کا حال سُنا ہے جس کو خالق سے انسان
کی کوتاہیٔ عمر کی شکایت تھی۔ یہ اسی فکر میں رات دن غلطاں و پیچاں
رہتا تھا کہ ایک دن اسکو حضرتِ خضر مل گئے۔ حضرت کو دیکھتے ہی
پہلا سوال جو اس بھلے آدمی نے کیا یہی تھا کہ درازیٔ عمر کی کوئی
تدبیر بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تو آنکھیں بند کر اور دیکھ کیا نظر آتا ہے
بزرگوں کے کہنے سے آنکھیں بند کرنے کی خاصیت ہے

کہ آنکھیں کھلی رہیں تو شاید کچھ نظر نہ آئے مگر آنکھیں بند کر لیجئے تو خدا جانے کیا کیا دیکھ لیجئے۔

اِس خدا کے بندے نے جونہی آنکھیں بند کیں تو کیا دیکھتا ہے کہ بحرِ ظلمات کے کنارے ایک بستی ہے جسکا نام ازازل تا ابد ہے یہاں کے لوگوں نے جونکوں کی طرح آبِ حیات چوس کر پی لیا کہ اب اس میں ایک قطرہ پانی نہیں۔ ایک آدھ قطرہ کیچڑ مٹی میں جو رہ گیا وہ بگلے اور کوّے جو اِدھر سے نکلے پی گئے اِس وجہ سے ان کی عمر بھی بہت بڑھ گئی۔

دیکھنے والا کہتا ہے کہ میں وہاں کے لوگوں سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہاں مرنا تو درکنار بیماری کا بھی رونا ہے۔ آب وہوا ایسی مزاج کے موافق کہ کسی کو بیمار پڑتے بھی نہیں سُنا، مرنا تو خیریت ہے عمر میں خضر سے کم نہیں مگر بے فکری اُن سے کہیں زیادہ حضرت کو تو بھولے بھٹکے مسافر کی فکر رہتی ہے۔ یہاں کے باشندوں کو کسی طرح کا فکر نہیں۔ ہر چیز بے دردِ سر موجود، کسی کام میں تگ ودَو کی ضرورت نہیں۔ بُرا بھلا کسی کو کوئی مشغلہ نہیں کسی کے ذمّے کوئی دھندا نہیں نتیجہ یہ کہ رات دن کی فرصت سے جینا اجیرن معلوم ہوتا ہے۔

عالمِ فانی کی خبریں جو وہاں پہنچتی ہیں کہ آج فلاں مرا کل فلانا تو وہاں کے باشندے کس حسرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتے ہیں منشیِ فلک سے پوچھتے ہیں کہ ہماری عمر کے کاغذ کہاں ہیں۔ جواب

ملتا ہے کہ مجھے اپنے زمانے سے پہلے کی خبر نہیں۔ حضرت عزرائیل یوں تو گھر گھر بے بلائے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر یہاں آتے پاؤں ٹوٹتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ان کے دیکھنے کا روادار نہیں اور ہم ان کی صورت کو ترستے ہیں۔

راوی کا بیان ہے۔ میں نے پوچھا کہ تمہیں اپنی درازیٔ عمر کی قدر کیوں نہیں۔ کہا کہ ہر چیز کی قدر بالضد ہے۔ جینے کا مزہ مرنے سے ہے اور راحت کی قدر تکلیف سے۔ غم نہ ہو تو خوشی کا لطف نہیں۔ رنج نہ ہو تو آرام کو لے کر کیا کیجئے۔ میاں بیوی رات دن چپ سادھے رہیں تو اس سے لڑنا کہیں اچھا ہے۔

گلاب اگر مرجھائے نہیں تو اس کے رنگ و بو کی کوئی قدر نہ کرے باغ میں خزاں کا دخل نہ ہو تو بہار کو کون پوچھے۔ چاند گھٹے نہیں تو بڑھنے کی کیا تعریف۔ اندھیری رات نہ ہو تو چاندنی مبروص[1] کا جسم ہے۔ چکوا چکوی (سُرخاب کا جوڑا) رات بھر جدا رہتا ہے کہ ایک دریا کے اِس کنارے تو دوسرا اُس کنارے۔ پھر دن کو جس محبت سے ملتے ہیں اُن کے دلوں سے پوچھئے۔

نفقراء تارک الدنیا کو جب اِس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ فنا ہونے سے بقا کی اُمید ہے تو اپنے نفس کو مارنا پسند کیا۔ اسی پر کیا اُس کی[2] راہ میں جان دینی مآل زندگی سمجھا گیا جس نے جسقدر زیادہ اپنے نفس کو مارا

[1] جس کو برص کی بیماری ہو۔ اس بیماری سے بدن پر سفید سفید دھبّے پڑ جاتے ہیں۔ [2] خدا۔

اُسیقدر وہ بڑا ولی مانا گیا۔ نفس ہی کے مارنے کے لئے ریاضات شاقہ گوارہ کی گئیں۔ کھانا کم اور سونا اس سے بھی کم۔ دنیا کی طرف سے منہ پھیرنا اور اُس سے لَو لگانی جس کو دیکھا نہ بھالا سہ

یہ اندازِ جنوں اچھا نکالا
لیا پہچان گو دیکھا نہ بھالا

غرض جہانتک دیکھا گیا مرنا ہی محبوب نعمت نکلا جو آبِ حیات کے پینے والوں کو میسّر نہیں۔ یہ شخص جس کو انسان کی کم عمری کا غم تھا کہتا ہے کہ زیادہ جینے والوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے اُن لوگوں پر رحم آیا جن کو مرنے کا بھی سہارا نہیں۔ کہ مایوسی میں اس سے بڑھ کر نعمت نہیں جس کو یہ نعمت میسّر ہے وہ دنیا کی تمام مصیبتوں پر جی کھول کر ہنسے۔

مرغانِ گرفتار پر رحم کرنے والی صرف موت ہی ہے کہ مری ہوئی چڑیا کو صیاد قفس میں ہرگز نہیں رکھتا۔

رات کو نیند کی غفلت میں آنکھیں بند کر لینے کی اور بات ہے جان بوجھ کر آنکھیں بند رکھنی مشکل ہیں۔ کہانتک بند رکھتا۔ آنکھیں کھولکر دیکھا تو نہ حضرتِ خضر نظر آئے نہ آبِ حیات۔

مداری

چرخِ شعبدہ باز

اساتذہ کے لٹریچر میں آسمان کا ذکر اس کے عدم وجود کے ثبوت میں اسقدر نہیں جبقدر کہ اس کی شعبدہ بازیوں کا حال ہے۔ آسمان کے عدم وجود سے مجھے بھی بحث نہیں لیکن اس کی شعبدہ بازیاں واقعی اسقدر مشہور ہیں کہ تمام دنیا کے مداری۔ بھان متی۔ بازی گر اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔ چرخِ شعبدہ باز کا یہ ایک ادنیٰ کھیل ہے کہ اس کے نیلے پٹارے میں سے جسے آسمان کہئے آغاز عالم سے خدا جانے کتنے چھوٹے بڑے نکال چکا ہے اور نکالے چلا جائیگا۔ بڑے بڑے شعبدہ باز و نظر باز اس کے الٹ پھیر کو نہ سمجھ سکے۔ شعبدہ بازی کے کمال میں ہے کہ بچے کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیا تو گویا بہت بڑی بات کی۔ سو وہ بھی ایک آدھ کو اور دو چار بار۔ چرخِ شعبدہ باز کو ایک زمانہ گذر گیا کہ ہر بچے کو بوڑھا کر کے دکھا رہا ہے۔ مداری ایک شاخ سے درخت بنا کر دکھاتا ہے اور دور سے پھل بھی مگر یہ پھل دور سے دیکھنے کے سوا اور کسی

کام کے نہیں اور دیکھنا بھی چند ساعت کا۔ یہاں ایک رائی کے برابر دانے سے سر بفلک درختوں کے جنگل دیکھ لیجئے بہار کو خزاں اور خزاں کو بہار کر دکھانا اسکا معمولی کھیل ہے۔ تمام عالم کے درخت جو ابھی برگ و بار سے عُریاں تھے یا دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑ چکے تھے کہ بہار نے ایک بار گی سب کو سبز و سرخ جوڑے پہنا دیئے معمولی بازی گر شکل سے آگ اور پانی اکٹھا کر کے دکھاتے ہیں۔ عالم اسباب نے نہ صرف آگ و پانی کو بلکہ ہوا و خاک اربعہ[1] عناصر کو جمع کر کے بے گنتی پُتلے بنا بنا کر دکھا دیئے اور انھیں کو بگاڑ کر بناتا چلا جاتا ہے۔ ایک کو مارتا ہے تو دو کو جلاتا ہے۔ دس دانے زمین میں دباتا ہے تو سو اگاتا ہے، بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور جاندار کو بے جان کر دیتا ہے۔

ایک شاخ سے دو پھول نکالتا ہے ایک کو حسینوں کے گلے کا ہار بناتا ہے دوسرا قبر پر چڑھایا جاتا ہے۔ آسمان کی وہی بارش جو انگور پیدا کرتی ہے اُسی سے اونٹ کٹارے پیدا ہوتے ہیں۔ چرخ کی ایک گردش دولابی[2] نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا قصور کنوئیں میں گرایا۔ اُسی آسمان کی کروٹ نے حضرت یوسف کو عزیزِ مصر کر دکھایا اُسی آسمان کی ایک ایک کروٹ میں نادر۔ تیمور چنگیز خاں و ہلاکو سی بے گنتی کٹ پتلیاں نکل پڑیں، پھر ایسی غائب ہوئیں کہ مہ و خورشید کی

---

[1] چار عنصر جن سے دنیا بنی ہے آگ۔ پانی۔ خاک۔ ہوا۔ [2] رہٹ کی سی حرکت جس کا انسان کبھی نیچے کبھی اوپر آجاتا ہے۔

عینک سے بھی نظر نہ آئیں۔

اور تماشے تو اگر دو چار دفعہ دیکھئے یا ایک ہی تماشہ دیر تک دیکھتے رہیئے تو آجیرن ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے آسمان کی شعبدہ بازیاں ہمیشہ دلچسپ ہی دیکھ لیجئے۔ محبت کے افسانوں میں ابروئے خمدار کے مارے ہوئے اسقدر نکلیں گے جتنے کسی تاریخ میں تلوار کے مارے نہ نکلیں گے۔ چرخ نیلوفری نے ایسے رنگ بدلے ہیں کہ کسی رنگریز کے فرشتوں نے نہ دیکھے نہ سُنے۔

دنیا میں آجتک کسی نے نہ جانا کہ یہ تماشہ کب سے ہو رہا ہے۔ اتنا دکھائی دیتا ہے کہ جس طرح مداری گولیاں اُڑا کر ایک دو کو اُنگلی کے اشارے سے کہہ دیتا ہے کہ وہیں تھم جا اسی طرح انسان کی زندگی ہے کہ دم بھر کو ٹھہری دکھائی دیتی ہے۔

چرخ کج رفتار اس کی کج رفتاری کوئی نئی بات نہیں۔ حسین بھی اٹھلا کر چلتے ہیں اور بُرے نہیں لگتے۔ مگر آسمان کی رفتار عجیب ہے کہ خدا جانے کب سے یہ چال چل رہا ہے اور آجتک تھکا نہیں۔ نہ اس بات کے آثار ہیں کہ کبھی تھکے گا۔ خوبانِ جہان نے ستم شعاری میں گو آسمان کی نقل تھوڑی بہت اُڑائی مگر ان سے نبھی نہیں کہ زیادہ عمر ہوئی نہیں اور جفا شعاری بیکار گئی نہیں۔ پیر گردوں کی عمر جسقدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی جفا پیشگی میں کمی تو کیا ترقی ہی نظر آتی ہے۔

دنیا میں کوئی تماشہ اسقدر عبرت انگیز نہیں دیکھا جسقدر کہ گردشِ

دوراں کا۔ باغ میں بجلی اُسوقت گرتے دیکھی جبکہ مرغ چمن نے خس و خاشاک سے آشیاں بنا کر ذرا آرام کرنے کا ارادہ کیا ؎

سعد اللہ کا کئے آئے تو اُسدم
جب آتش لگ رہی تھی آشیاں کو

کھیت پک کر تیار ہوا کہ ٹڈی آپڑی۔ منزل دو قدم رہ گئی کہ پاؤں جواب دے گئے۔

لیکن سب سے بڑا تماشہ چرخِ شعبدہ باز کا ہمارا مرنا اور قیامت کا اٹھنا ہے۔ میں اِس کو تماشہ اِس لئے سمجھتا ہوں کہ اہلِ نظر کی نگاہ میں یار کی ہر ادا پر مرنا ضرور ہے اور قیامت تو خرامِ ناز سے بپا ہوتے شاعروں نے ہزار بار دکھادی۔

عاقبت کا خیال مجھے اِس لئے زیادہ پسند ہے کہ اگر واقعی نہ ہوا تو اس کو غلط سمجھنے کی ہمت کسے ؎

گئی گر فصلِ گل، ہے ابر موجود
ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں

چرخ کی شعبدہ بازیوں میں ایک خصوصیت ہے جو دنیا کے اور شعبدوں میں نہیں۔ اور شعبدہ بازوں کے کھیل تماشے ختم ہونے پر لوگ ہنستے خوش ہوتے اُٹھتے ہیں۔ چرخ شعبدہ باز کے جتنے کھیل تماشے ہیں سب کا انجام رونے پر ہے۔

کسی کی تمنّا اگر بعد از خرابی بصرہ بر آئی ہو تو کب کہ جب لطف آید

نہ رہا قیس کو جیتے جی لیلیٰ نصیب نہ ہوئی۔ نعش پر ماتم کرنا قسمت میں لکھا تھا۔ شیریں کو فرہاد کی محبت کا جوش اُسوقت ہوا جبکہ فرہاد سر پھوڑ چکا تھا۔ یوسف کو زلیخا اُسوقت یاد آئی جبکہ زلیخا اپنی جوانی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اور حضرت جامی نے اُسے دوبارہ جوان بنایا مگر وہ بات پھر تیسر نہ ہوئی کہ زنانِ مصری نے جو زلیخا کو عشق یوسف پر ملامت کرتی تھیں۔ بے ہوشی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور خبر نہ ہوئی ؎

مستوں نے ترکِ مے کی قسم کھائی بھی تو کیا
توبہ کہاں وہ بات جو مستی چلی گئی !

صوفیائے کرام کا قول ہے کہ ازل میں سب سے پہلے حرفِ عشق پکارا گیا۔ مجھے اپنے مضمون کی دھن میں خیال آیا کہ عالمِ اسباب میں مادرِ گیتی کے پہلے بچے کے کان میں اذان کی جگہ چرخِ شعبدہ باز نے یہ پھونک دیا کہ "بڑے بڑے کھیل تماشے"۔ اور اپنا پٹارہ سامنے لے بیٹھا۔ اب دنیا ہے کہ دیکھنے چلی آتی ہے اور محوِ تماشہ ہے وہی آواز ہر شخص کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

(از صلائے عام)

چکبست

برج نرائن نام اور چکبست خاندانی لقب ہے۔ ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے مگر چند سال بعد لکھنؤ آ گئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کی۔ اس پیشہ میں ان کو نمایاں کامیابی ہوئی اور چند ہی سالوں میں ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں رائے بریلی تشریف لے گئے۔ سہ پہر کو جب لکھنؤ واپس جانے کے لئے اسٹیشن پر آئے تو ریل میں بیٹھتے ہی دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ویٹنگ روم میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے مرض کو دبانے کی ہزاروں کوششیں کیں مگر سب بے سود۔ سات بجے شام کو اسٹیشن پر انتقال کیا۔

چکبست کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ۹ برس کی عمر سے

برابر شعر کہتے رہے۔ غزل میں آتش اور غالب کے پیرو ہیں۔ اور مسدس میں انیس کا رنگ جھلکتا ہے۔ گو چکبست نے نئے خیالات ضرور نظم کئے لیکن سلاست۔ بندش الفاظ حسنِ ترکیب۔ لطافت اور پاکیزگی کا جوہر ہاتھ سے نہیں دیا۔

چکبست اردو نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ ان کے مضامین زیادہ تر ادبی تنقید اور تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں جن میں تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار قایم کیا ہے۔ یہ مضامین سلاست شگفتگی اور متانت کے لحاظ سے اردو نثر کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔

تاریخ

موجودہ تہذیب کا ایک علمی اصول ہے کہ دنیا میں جسقدر رسم و رواج یا علوم و فنون ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں فن تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گذرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اس کے لئے معمے سے کم نہ تھے۔ اس عالم حیرت میں اس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے۔ وہ اس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہیں کبھی راتیں۔ کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام یا ترتیب نہیں پاتا تھا۔ ان انقلابات سے

متاثر ہو کر وہ دنیا کی کیفیت تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ
طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں ان کی گفتگو تشبیہ اور
اور استعارے کے پیرائے میں ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ
کہنا ہو گا کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے۔ تو وہ یہ کہے گا۔ کہ اس کے گھر کی
پتیاں میرے گھر میں اُڑ کر آتی ہیں" چنانچہ زمانہ گذشتہ میں بھی وحشی قوموں
کا یہی رنگ تھا۔ اس قسم کے گیت یا نظمیں ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ
میں موجود ہیں۔ جن میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں جو کہ انسان کے
دل میں ابتدائی تہذیب میں پیدا ہوئے ہونگے۔ مثلاً سیاروں کو ایک
قسم کا دیوتا مانتا ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت اور شوکت سے
متاثر ہو کر ان کی پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات دلی جوش
میں آتے ہیں تو وہ ان خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے جو کہ نظموں
یا گیتوں کی شکل میں یاد رہجاتے ہیں اور آئندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ
کا کام دیتے ہیں جس سے اسوقت کی تہذیب اور ترقی کی حالت آئینہ وار
نظر آتی ہے۔ ایسی نظموں وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان میں مائی تھالوجی
کہتے ہیں۔ خلافِ عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہیں سمجھنا چاہیئے
ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہیں ہوتی ہے لیکن
اسوقت کی تہذیب کا بحیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے جسوقت کہ
نظمیں تصنیف ہوئی تھیں۔ اور یہ ایسی تحقیقات ہے جو کہ تاریخی تحقیقات
کی حد سے کسی حالت میں باہر نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ

تاریخی صراحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے۔ فنِ تاریخ کے ابتدائی کارناموں سے ہم خارجی واقعات کی تصریح عمل میں نہیں لاسکتے لیکن اسوقت کے انسانوں کے جذباتِ دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کرسکتے ہیں اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلیٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہیں۔ یہ فنِ تاریخ کی ابتدائی منزل ہے

دوسری منزل میں اِس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی جبکہ انسان ترقی کے میدان میں دس قدم اور آگے بڑھا۔ اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہور میں آئیں۔ اِس حالت میں تاریخ صرف ان جذبات و عقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل میں محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے بلکہ اس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا لیکن یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کئے گئے۔ ہر روایت کے بیان میں خیالی عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اِس دور میں پیدا ہوئے ان کی تعریف میں بہت سی داستانیں کہی گئیں۔ کچھ نظمیں کچھ نثریں۔ مگر واقعات کی صراحت کا خیال بالکل بالائے طاق رہا۔ اِس قسم کی داستانیں پڑھنے سے ہم کو ہزاروں تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے

ظاہر

بڑھنا

دلچسپ

بچھوڑن

ہر واقعہ کے بیان میں مبالغہ کو بہت دخل ہے۔ مثلاً لڑائیوں کی داستانیں
اس طرح لکھی گئی ہیں جنہیں عقل انسانی کبھی قابلِ اعتبار نہیں مان سکتی۔ دنیا
اکثر عظیم الشان انسانوں کی تعریف میں مبالغہ درجۂ اعتدال سے گذر گیا
ہے۔ یوروپ میں آرتھر ہرکولیز وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانوں
کی مثالیں موجود ہیں جن کی بہادری اور روئیں تنی کی تعریف میں دریا بہا
دئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مہابھارت کے سورمیران کے جواب
ہیں۔ ان کی بہادری کی روائتیں جس طرز پر لکھی گئی ہیں اُن سے صاف
ظاہر ہے کہ کسقدر مبالغہ آمیز ہیں۔ مہابھارت کے ہرکولیز یعنی
بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ اُس نے غصّے کے عالم میں ایک
بہت بڑا درخت زمین سے اُکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح
کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینکدے۔ گو بادی النظر میں یہ واقعہ
خلافِ قانونِ قدرت معلوم ہو لیکن اصل میں یہ ایک بہادر اور قوی
ہیکل شخص کی بہادری اور روئیں تنی کی مبالغہ آمیز تعریف ہے۔ اس
اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکائتوں کا مطالعہ کریں تو ہم بہت کچھ
تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مبالغہ
پسندی کی وجہ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے
لوگوں کی نسبت مبالغہ آمیز روائتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور جسقدر زمانہ
گذرتا جاتا ہے اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلافِ قدرت
کرشموں کا انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ نہیں کیا انہیں کا وہ مجموعہ

تبلائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بت پرستی کے خلاف اُس نے وعظ کہا۔ لیکن برہمنوں نے پران بنا کر اُسکو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور اس کے مریدوں نے اس کے مرنے کے بعد اُس کا بت پوجنا شروع کر دیا ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا سیواجی کی مثال بہت نزدیک زمانے کی مثال ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سیواجی انسان تھا۔ اس کے وقت کی قابلِ اعتبار تاریخ موجود ہے لیکن مہاراشٹ میں ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ سیواجی شیوجی کا اوتار تھا۔ اور اس کی پیدائش ایک معجزے کے ذریعے سے ظہور میں آئی تھی۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان میں چونکہ عظمت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہیں۔ اِس وجہ سے مبالغہ آمیز روائتیں بڑے بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں۔ یہانتک کہ اکثر ان کی پرستش ہونے لگتی ہے ابتدائے تہذیب میں چونکہ یہ جذبات نہایت زور شور کے ساتھ انسان کے دل میں پائے جاتے تھے اور اس کا عقیدہ غائبانہ روحانی قوتوں میں تھا لہٰذا اُس زمانے میں جو عظیم الشان انسان گذرے ان کے مداحوں نے ان کو آسمان پر چڑھا دیا اور ان کی تعریف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مبالغہ پسندی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک قسم کی عزت تھی کہ بڑے آدمیوں

کی صفت میں مبالغہ سے کام لیا جائے۔ نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ بزرگوں
کے کارناموں پر جسقدر خیالی تعریف کی وارنش کی جائے زیبا ہے۔
لہذا جب ہم اس قسم کی روائتیں پڑھیں تو ہم کو اس امر کا خیال لازمی ہے
کہ ہم اصلی واقعات بجنسہ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان واقعات کی وہ تصو
دیکھ رہے ہیں جس میں کہ بہت کچھ مبالغہ کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ فن تاریخ
کی دوسری منزل کی حالت ہے۔

تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے
جبکہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی
تک اسکا منشا محض جذباتِ دلی کا اظہار تھا۔ یا بزرگوں کی عظمت کرنا
نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اس نے
گذشتہ و موجودہ واقعات کو یک جا جمع کرنا شروع کیا۔ لیکن یاد رہے
کہ اسوقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہیں پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے
کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت
کی فلسفیانہ تفسیر ہیں نیز اسوقت تک مبالغہ کو تاریخی واقعات لکھنے
میں بہت کچھ دخل تھا۔ ہراڈٹس[1] یوروپ کا اس رنگ کا پہلا باقاعدہ
مورخ ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں اکثر واقعات لکھے ہیں جو مبالغے
سے پُر ہیں یا اُسی زمانے کا ایک دوسرا مورخ ہے۔ اس نے صاف
الفاظ میں لکھدیا ہے کہ میں نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ

[1] یونان کا پہلا مورخ۔

اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔
جیسے فردوسی نے شاہنامے میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان[1]
وگرنہ یلے بود در سیستان

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا مذاق اس حد سے آگے نہ ترقی کر سکا یہاں پرانین وغیرہ موجود ہیں جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے مختلف علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی تھی جس کی ثنا و صفت میں یورپ کے محققین تر زبان ہیں لیکن فن تاریخ نے یہاں نشوونما نہ پائی۔ اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کے دوران حکومت میں اکثر جابر اور متعصب فرمانرواؤں نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا دیں۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔

کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے۔ مگر تاریخی کتابیں اس انتظام کے ساتھ جلائی گئیں کہ ان کی خاک بھی سرمے کے لئے نہیں ملتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ فنِ تاریخ نے اسی ملک میں زیادہ نشوونما پائی کہ جس ملک میں نظامِ

[1] رستم کو میں نے رستم بنا دیا ورنہ وہ سیستان کا رہنے والا ایک معمولی پہلوان تھا۔

معاشرت پولیٹیکل اصولوں پر مبنی تھا۔ ہندوستان کی حالت جداگانہ تھی۔ یہاں نظامِ معاشرت کا دار و مدار محض مذہبی اصولوں پر تھا۔ یہاں دنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی۔ اس لئے فنِ تاریخ کو قابلِ اطمینان ترقی نہ ہوئی۔ کیونکہ فنِ مذکور زیادہ تر دنیاوی کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔

اب فنِ تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہیں رہا تو اس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا۔ بلکہ ان کی رفتار کا بحیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا۔ عام اسباب سے عام نتائج اخذ کئے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے اور ان عام اصولوں کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اس دماغی ترقی کے ساتھ نظامِ معاشرت کی سادگی میں بھی روز بروز فرق آتا گیا اور زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی۔ اس حالت میں تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ ان واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہوگئی۔ اس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یوروپ میں پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ عربی فارسی وغیرہ میں اکثر مستند تاریخیں موجود ہیں مگر ان میں صرف سلطنتوں کے کمال و زوال کی داستانیں درج ہیں۔ مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان میں ذکر نہیں ہے۔ یوروپ میں سب سے پیشتر ملک

اطالیہ میں ویکو نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد جرمنی، انگلستان وغیرہ میں ایسے مورخ پیدا ہوئے جنہوں نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر تاریخ میں نقادانہ نظر ڈالی۔ آخر کار فرانس میں گیزو نے تاریخ تمدن لکھ کر تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ غرض رفتہ رفتہ فنِ تاریخ ترقی کرتا گیا اور آخر کار تجربے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فنِ تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے یعنی مورخ کامل وہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصور کا قلم رکھتا ہو۔ دماغ سے فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر کھینچے لیکن ابھی تک غالباً یورپ میں بھی کوئی ایسا مورخ نہیں پیدا ہوا جس میں یہ دونوں وصف درجۂ کمال پر پائے جاتے ہوں۔ بالفعل وہاں فنِ تاریخ دو حصوں پر منقسم ہے ایک فرقہ ایسے مورخین کا ہے جس نے واقعات کی تشریح اور ان کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا حصہ کر لیا ہے۔ دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگاروں کا۔ اس قسم کے مصنفین زمانہ ہائے دور دراز کی سوسائٹی کے طرزِ معاشرت کی تصویر افسانوں کے پیرایوں میں کھینچتے ہیں۔ جو شخص کہ پورے طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ان دونوں قسم کی تصانیف کی سیر ضروری ہے۔ ہمارے اردو لٹریچر میں تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگوں کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ مثلاً شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ

صاحب نے اکثر تاریخیں لکھی ہیں۔ مگران تصانیف میں اُس نقادانہ کیافت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو فنِ تاریخ کی شان میں داخل ہے۔ مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں۔ بیشک اُردو میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اِس کتاب کا نام دربار اکبری ہے اور اِس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنف محمد حسین آزاد ہے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

قوتِ گویائی

دربارِ اکبری میں محض اکبر کے زمانے کے محاربات وغیرہ ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اکبر کے زمانے کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے اِس نامور مصنّف سے نظم اُردو کی تاریخ آبِ حیات کے نام سے یادگار ہے۔ یہ تاریخ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

علاوہ اِن نامی مصنفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخیں ہندوستان کے مختلف حصّوں کی لکھی ہیں اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے مگر افسوس ہے کہ فنِ تاریخ کی دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشوونما نہیں پائی۔ یوں تو ایسے فسانہ نگاروں کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا ہے جو اپنے تئیں تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ مگر ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہیں پیدا ہوا جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے لقب کا مستحق ہو۔ میری نظر سے اکثر فسانے گذرے ہیں جن کی لوح پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ تاریخی فسانہ ہے۔ مگر ایک فسانے کے پڑھنے سے بھی اِس

زمانے کی سوسائٹی کے طرزِ معاشرت کا پتہ نہیں چلتا تھا جس زمانے کا ان فسانوں میں ذکر تھا۔ ان میں محض تاریخی واقعات درج کردئیے گئے ہیں۔ مگر ان کے مصنف زمانۂ دیرینہ کے مردہ قالبوں میں جان نہیں ڈال سکتے تھے۔ ایک فسانے میں جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس میں کہ ہزار برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا۔ یہ واقعہ نظر سے گذرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا۔ حالانکہ عرب میں اب تک رجسٹری کا پتہ نہیں ہے۔ ایک صاحب نے اپنے تاریخی فسانے میں کسی مغربی عورت کے حسن کی تصویر میں سیاہ اور چمکدار زلفیں بھی شامل کر دیں حالانکہ مغرب میں سنہرے اور گھونگر والے بال ہوتے ہیں۔ نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفیں۔

ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانے میں جو کہ راجپوتانے کی سَو برس اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے محل میں مختلف آرائشوں کے علاوہ اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں گیس کی روشنی کہاں؟

اس تشریح کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ فنِ تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا کیا رنگ بدلے اور جو کچھ میں نے اس حد تک تحریر کیا ہے اسے میں فنِ تاریخ کی تاریخ کہونگا۔ مذکور الصدر اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو بہت سی کاوشیں رفع ہوجائینگی مثلاً ہم پر یہ روشن رہے گا کہ پرانی کتب مذہبی جنہیں ہم تقویمِ پارینہ

خیال کرتے ہیں۔ ایک قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہیں جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یا مہابھارت الیڈ[1]۔ اڈیسی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہیں جن میں ایسی روایتیں درج ہیں جو کہ مبالغے سے خالی نہیں۔ مگر جن کی اصلیت ضرور ہے۔ علاوہ بریں مطالعہ تاریخ میں ہم کو اور چند امور کا بھی خیال لازمی ہے۔ اولاً یہ ہے کہ تاریخ پڑھنے میں ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہیں پڑھ رہے ہیں جس میں بادشاہوں کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہیں۔ برعکس اس کے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا کیا معیار رہا ہے جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجوں کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مذہبی انقلابات پر ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانوں میں سوسائٹی پر حاوی رہے ہیں۔ اور علم طبعیات کی ترقی کے ساتھ ان عقائد میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ان مذہبی انقلابات کے ساتھ سوسائٹی کے سوشل رسم و رواج کا کیا رنگ رہا ہے۔ کون اصول دیرپا ثابت ہوئے ہیں اور کن کو زمانے نے فنا کر دیا ہے۔ اس انداز پر مطالعہ تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستان غیر مسلسل نہ نظر آئے گا بلکہ ہم پر یہ امر آئینہ ہو جائے گا۔ کہ یہ اخلاقی مذہبی اور سوشل قوتوں اور ان کے نتائج کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہ ازل سے

---

[1] الیڈ اور اڈیسی یونان کے مشہور اور قدیم شاعر ہومر کی تصانیف ہیں۔

شروع ہوا ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔

دوسرا امر جس کا خیال مطالعہ تاریخ میں لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہیئے محض بڑی بڑی لڑائیوں کی حکائتیں یا انقلاب عظیم کی داستانیں یاد کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں ہم کو زیادہ تر توجہ ان واقعات پر کرنا چاہیئے جو کہ بادی النظر میں غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جو در اصل قوم یا ملک کے اخلاق یا عادات پر اثر کرتے آئے ہیں مثلاً علمی ترقی یا جہالت کی طرف سوسائٹی کے رجحان کا اندازہ کرنا افلاس و دولت مندی کی مختلف حالتوں پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایسی پنہاں قوتیں ہیں جن سے کہ بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آ سکتے ہیں۔ لہٰذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہیں بلکہ ان پنہانی اخلاقی اور علمی قوتوں پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہیئے جن کے زوال و کمال کے ساتھ ملکوں اور قوموں کے زوال و کمال کی داستانیں رہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے وہ تلوار کے زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبر یہ پھیلایا گیا ہے۔ ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارے سے ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک

زبردست اخلاقی قوت تھی جوکہ رسول عربی کی تلقین سے ظہور میں آئی تھی۔ اور جس نے عرب کے جاہل وحشیوں کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا۔ مسلمان ایمان پر جان ودولت قربان کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اور یہی زبردست قوتِ اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکہ دنیا میں جاری کر دیا۔

اسی طرح اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مرہٹوں کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ سیواجی محض ایک زبردست لٹیرا تھا۔ لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹوں کی حیرت انگیز ترقی کی داستان پڑھی جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ مرہٹوں کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج وفائدے کے لئے نہیں لڑتے تھے۔ بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے۔ اور یہ زبردست اخلاقی قوت سیواجی کی بہادری اور جان نثاری سے پیدا ہوگئی تھی جن صاحبوں نے جناب[1] رانا ڈے مرحوم کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے جس کا نام **عروج سلطنت مرہٹہ** ہے۔ وہ میرے اس دعوے کی تائید کرینگے۔ مراد ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ محض بڑی بڑی انقلابی حالتوں کے ظاہری عنوان تک مطالعہ تاریخ میں نظر نہ محدود رکھنی چاہئیے۔ بلکہ ان انقلابات کے

---

[1] مہا دیو گوبند رانا ڈے بمبئی ہائیکورٹ کے جج اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے سرآوردہ لوگوں میں تھے۔

اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہئیں۔ مطالعہ تاریخ میں اِس بات کی
بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعہ کا اندازہ تحقیق وتنقید سے کیا جائے
کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے کبھی
قابلِ اطمینان نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ بلکہ نتائج کی صحت میں فرق آجانے
سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ
بالفعل ہندوستان میں تاریخی مطالعہ کے وقت بہت کچھ تعصب سے
کام لیا جاتا ہے۔ یہاں رسم ورواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیاں ایسی
مضبوط کَسی ہوئی ہیں کہ پُرانی بات کو عزّت کی نگاہ سے دیکھنا اصولِ
اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ اِس کا اثر مطالعہ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً
اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے
ہیں تو ان کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو واقعات کہ پُرانے ہندوؤں
کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہوں اُن کی تشہیر کی جائے اور
پدرم سلطان بود کا غلغلہ بلند کیا جائے اور اگر کسی طرح یہ ثابت
ہو جائے کہ قدیم ہندوستان میں ریل اور تار برقی کا سامان موجود تھا
تو پھر کیا کہنا ہے اور جب اِس وضع کے حضرات کو کسی ایسی لغزش
کا سامنا ہوتا ہے جس سے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی
کسی اخلاقی یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ فکر ہوتی کہ کسی
طرح اِن واقعات پر خاک ڈال دی جائے یا اکثر بانیانِ اصلاح نے
یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کی عمل میں لانے کی کوشش

شروع کرتے ہیں تو اختلاف کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہیں کہ تاریخی واقعات توڑ مروڑ کر لفظی شعبدہ پردازی سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہم نئی بات نہیں کہتے ہیں بلکہ ایک پرانی رسم تازہ کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک بزرگوار پردے کے خلاف ہیں انہوں نے اپنے دلائل میں اس بے بنیاد تاریخی تصرف کو بھی شامل کیا ہے کہ مسلمانوں میں کبھی پردے کی رسم نہ تھی۔ ہندوستان میں چین سے پردہ آیا اور ہندوؤں سے مسلمانانِ ہند نے پردے کی رسم سیکھی۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی قابلِ وقعت تاریخی شہادت نہیں موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہندوستان نے چین سے پردہ اڑایا اور مسلمانوں پر ابر کی طرح چھا گیا اسی طرح کی اور مثالیں موجود ہیں۔ مگر یاد رہے کہ اصلاحِ قومی کی عالیشان عمارت ایسی سست بنیاد پر تیار کرنا خالی از اندیشہ نہیں ہے۔ اِن خدا کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش میں دروغ مصلحت آمیز شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے بزرگ انسان نہ تھے۔ کیا ان کی تہذیب فرشتوں کی تہذیب تھی کہ اس میں نقص دریافت کرنا کفر میں داخل ہے۔ اِن سب باتوں کو چھوڑ کر ہمارا فرض یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کریں جو لغزشیں اپنے بزرگوں کے نظامِ معاشرت میں دیکھیں اُن سے عبرت حاصل کریں اور ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔

سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعہ تاریخ کی نسبت یہ ہے کہ ہمیں اپنے ملک یا قوم کی تاریخ کو کل دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اس عظیم الشان تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب اور ترقی کی داستان ہے۔ اور جس کا سلسلہ زمانہ قدیم میں دور تک پہنچتا ہے۔ اگر غور سے ہم تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالیں تو ہم پر ثابت ہو جائیگا کہ ہماری موجودہ حالت ان ہزاروں اخلاقی اور علمی قوتوں کی مدد سے ظہور میں آئی ہے۔ جو کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک مختلف ملکوں اور قوموں میں کام کرتی آئی ہیں۔ ہزاروں دل و دماغ تحقیقات علمی کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے۔ اور ایک ملک کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے۔ مثلاً اس زمانے کی سیر کرو جب وادی انڈس میں تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ چین میں علم و فن کی ترقی ظہور میں آرہی تھی۔ بابل میں تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جما رہی تھی۔ پھر اس زمانے کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچو۔ تعلقات باہمی شروع ہوئے۔ مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے۔ غرضکہ اسی طور سے دنیا روز بروز ترقی کرتی گئی۔ آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ ہیں۔ مختلف رنگ کے پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے

ہیں اور ہمارے دلوں کو سرور اور آنکھوں کو نور بخش رہے ہیں۔ ان میں ایسے پودے بہت کم ہیں کہ جنہوں نے ابتدائے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب وہوا میں نشو ونما پائی ہو۔ برعکس اسکے ہر ایک پودا ایسا ملیگا جس میں دوسرے ملک کے پودے سے لاکر قلم لگائی گئی ہے۔ دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے۔ اہلِ یوروپ نے اس میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی ہیں۔ اب اگر اس کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اہلِ یوروپ نے اہلِ عرب سے حاصل کیا ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے جہاں سے اہلِ عرب نے اسے سیکھا۔ ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کی ساٹھ سیکنڈ پر تقسیم اہلِ بابل کا ایجاد ہے۔

آتش فشاں آلاتِ حرب کی صنعت اہلِ یوروپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل میں اہلِ چین ان کے موجد ہیں۔ کیونکہ بارود چین ہی کی ایجاد ہے۔ فنِ جہازرانی آج کس ترقی پر ہے اس کے لئے بھی ایک معنی میں اہلِ چین کا شکریہ لازم ہے۔ کیونکہ قطب نما پہلے انہوں نے بنایا۔ دور کیوں جاؤ یوروپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہلِ عرب کے احسانوں سے گرانبار ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یوروپ میں پہلی یونیورسٹی اور پہلی رصدگاہ[1] مسلمانوں نے ہی قایم کی۔

اسی طرح اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ غرض کہ اس صورت میں

[1] وہ جگہ کہ جہاں سے تاروں کو دیکھتے ہیں۔

تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کُل پُرانی تہذیبوں کا عطر ہے۔ اور یہ ایسا اصول ہے جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمانوں کے جھگڑے "پدرم سلطان بود" کے نازِ بیجا پر قایم ہیں ہندو کہتے ہیں کہ ہم نے عاداتِ بد مسلمانوں سے سیکھے۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں کو اخلاقِ حسنہ سکھائے ہیں اُن سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ مگر دونوں فرقوں میں جن لوگوں کی نظر وسیع اور جن لوگوں کے دماغ علم تاریخ کے نور سے روشن ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندو بہت سی خوبیوں کے لئے مسلمانوں کے احسان مند ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے۔

جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ میں سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اُس میں ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤں نے انتظامی قابلیت اور قومی یگانگت کا اصول مسلمانوں سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانوں نے ہندوؤں سے۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے اُن کاوشوں سے نجات مل سکتی ہے جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجب روحانی سرور کا سرمایہ ہم پہنچاتی ہے اور عقل کو جِلا دیتی ہے۔ اِس عالم میں قدم رکھتے ہی تجربہ کا آفتاب ضیا افشاں نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اِس عالم

میں تہذیب اور ترقی کی وہ زبردست شاہراہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارہ ازل ہے اور دوسرا ابد۔ جس کی ہر منزل پر فیض کے چشمے جاری ہیں کہیں وہ بزرگ اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے مذہب اور فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی سے ایسے چراغ روشن کر گئے ہیں جنہیں ہوا ئے مخالف کے جھونکے نہیں بجھا سکتے اور جن کی روشنی میں اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں کہیں وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی ہے جس میں بڑے بڑے معجز نگار نثاروں اور شاعروں کا مجمع ہے۔ نکتہ سنجیوں کے گلدستے مہک رہے ہیں اور شراب سخن کا جادو چل رہا ہے کہیں ان قوی ہیکل اور ضیغم منش[1] جوانوں کی پر رعب صورتیں دکھائی دیتی ہیں جن کی چتونوں سے شجاعت کا نور برس رہا ہے اور جن کی تلواروں کے پانی سے اب تک مختلف قوموں کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ میں ہر علم و فن کے باکمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص عظیم الشان انسانوں کی صحبت میں بلا تکلف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے۔

---

[1] شیر جیسے بہادر

مرزا فرحت اللہ بیگ

پھول والوں کی سیر

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آجاتی ہے۔ اِدھر تاریخ مقرر ہوئی اُدھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں پتی پڑی حسبِ مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہو گیا اب رہے دوسرے خرچ وہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ جی چاہے سے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلّی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ لگا قطب تک دوکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی برجی اُس پر زردوزی کے پھول اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ سفید براق پہیے۔ اس پر رنگین بیل بوٹے۔ ناگوری بیل ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھونگرو سینگوں پر

لنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفا گھوڑوں پر سوار مخمل کی کارچوبی زین پوش۔ لیسیں ٹکی ہوئی۔ لگامیں گنگا جمنی۔ گہنا پہنے ہوئے گھوڑے۔ رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں ایک ہاتھ میں باگ ڈور دوسرے میں چوہری۔ سوار ہیں کہ شہسواری کے انداز دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔

غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے۔ صرف ایک تہمت بندھی ہے نہ جسم پر کرتہ ہے نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا مٹکا سر پر اوندھائے ہوئے سرپٹ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ اب نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے۔ تحفہ تحفہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے لپوان سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں، پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا کہ بھیگ نہ جائے ترکیب اچھی لگائی ہے سامان کا سامان بچا اور مٹکا قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح سے جو یہ لین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہو گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس میں کوئی مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب رہی عورتیں تو انہوں نے دلی ہیں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں۔ باغوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے۔ کڑاہیاں چڑھائیں۔ آم کھائے حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان

نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ سرکاری باغ میں دلّی والیاں جائیں تو جانے دو پردہ کرادو۔ باہر پہرہ لگادو۔ کہ کوئی مرد اندر نہ جاسکے۔ آگے یہ جائیں اور باغ جانیں۔ انہوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا آموں کی گٹھلیوں کے ڈھیر لگادئیے۔ دن میں کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے بھلا قطب میں ٹھہرنے کے لئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے۔ شاہی مکانات تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ امرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے کرائے پر لے لئے۔ غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے کچھ جھرنے میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے لیکن جن کو قطب کا لطف اٹھانا تھا انہوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینہ برستا ہے، برسنے دو۔ یہی قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اِس سرے سے اُس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئیں تھیں۔ میوے مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں، کچوریاں، بیوڑیاں، سُہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے۔ تو دوسری طرف کبابوں، پراٹھوں بریانی، مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک

سجاہ

ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا کھایا، پیتے وہیں پھینک پھانک آگے بڑھے۔ تنبواڑی کی دوکان پر پہنچے۔ بی تنبواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے کنگھی کئے۔ آنکھوں میں سُرمہ لگائے، دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے میٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان۔ لال لال صافیوں سے لپٹے سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے دوسروں کو کھلائے، پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دوکانوں سے گجرے لئے۔ گلے میں ڈالے ساقی کے پاس ٹھہر دو دم حقے کے مارے ایک دو پیسے دئے آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے، کوئی گز بھر اونچا نیچہ، اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے۔ نئے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نئے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں۔ نے پر خس چڑھا ہے اور موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں خود بھی سفید کپڑے پہنے بنارسی سیلہ باندھے۔ لال ٹپکا لپیٹے کھڑے پلا رہے ہیں۔ کوٹھوں والوں کو پلانا ہو تو نے سیدھی کر دی۔ انہوں نے بھی دو کش کھینچ لئے ادھر کسی نے مُہنال پر ہونٹ رکھے اور انہوں نے شعر پڑھنے شروع کئے سه

حُقہ جو ہے حضورِ معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھر اکہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکیں تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد جھرنے سے نفیری کی آواز آئی۔ لیجئے پنکھا اُٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنہ کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں، کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلہ پڑ رہا ہے جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ ارے بھئی جانے بھی دو، کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لینگے

پنکھا جھرنے سے اٹھا۔ شمسی تالاب سے ہوتا ہوا مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں لالٹینیں۔ گلاس۔ ہانڈیاں فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی کہ گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے۔ روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول۔ کسی کے گلے میں تاشہ، ہاتھوں میں چوبیں۔ دھوں دھوں کرتا اس طرح گذرا کہ سب کے کان گُنگ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے۔ زربفت کے پھریرے منقش کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لال ٹینیں۔ ایک لال ٹین کے سرے پر سنہرا ہلال۔ دوسرے پر روپہلی چکر۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا، اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ ان کے

پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصی بارہ دری ہے تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر اور کھپچیوں کا نصف گنبد بنا کپڑا منڈھ، پنّی لگا۔ کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندئی پردے ڈال۔ ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانہ کے پیچھے دلّی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک ایک اُستاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد۔ بنے ہوئے تیار۔ جسم چوڑے چوڑے سینے۔ بھرے ہوئے ڈنڈ۔ بھری ہوئی مچھلیاں پتلی پتلی کمریں جسم پر چُست جانگئے۔ گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ کہیں پھری گتکا سے مقابلہ ہو رہا ہے کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے پیچھے نفیری والے اور اُن کے ساتھ دلّی کے سقّے سفید بُراق کپڑے پہنے لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے ہاتھوں میں منجھے مَنجھائے پیتل کے کٹورے لئے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے۔ پندرہ بیس کا حلقہ بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سُر پہ ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تختِ رواں۔ تخت

رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے۔ کارچوبی دوپٹے اوڑھے
پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ
اور ترک سواروں کا رسالہ سرخ بانات کی وردیاں اُن میں سفید
بانات کے کف اور کالر شانوں پر فولادی جال۔ پاؤں میں کالی
برجیس چمڑے کے اونچے بوٹ۔ سر پر سرخ منڈاسے۔ ہاتھوں
میں لمبے لمبے برچھے لئے گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ
بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیلانیوں
کا اژدہام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے۔ کارچوبی ٹوپیاں۔
مداخل ٹکے ہوئے نیچے چولی کے انگرکھے۔ ایک برے چلے
سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے بعد بچہ پلٹن[1] کی چار قطاریں۔ کم عمر
گورے گورے لڑکے۔ سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر
چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز اطلس[2] کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی
برجیس۔ سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے۔ ہاتھوں میں سفید پھریرں
کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملائے

---

[1] شرفاء دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔
تھے توڑ کے گر غدر میں باڑھ کے نیچے سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان
کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی
فوج تھی۔ شاید اس لئے بے ضرورت سمجھا گیا۔ [2] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفا اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گیندئی پگڑیاں۔ مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی جریبیں[1]۔ ہشاش بشاش چہرے۔ گلے میں پھولوں کے کنٹھے۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اٹھاتے۔ میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ نفیری کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا۔ خود بھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا۔ پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس کو دیکھو اور پنکھے کو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا۔ پنی چڑھا۔ آئینے لگا۔ پھولوں سے سجا۔ ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوشِ محبت اور یگانگت کا نشان تھا۔ جس نے چھوٹے بڑے ہندو و مسلمانوں۔ غربا، امرا، غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز بنا تھا۔ اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا۔ جس میں خود بادشاہ شمع تھی اور رعایا اُن کے پروانے۔

غرض خلقت کا ہجوم پھوار میں بھیگتا خس کے پنکھے جھلتا آہستہ آہستہ

---

[1] جریب ہاتھ کی لکڑی کو کہتے تھے۔

مہرولی کی سڑک پر سے گذرا۔ باجہ والے اور نفیری والے ہر کمرے کے سامنے ٹھہرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجہ والوں نے اپنے کمال دکھائے اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے اپنے کٹورے بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو سیلہ ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا۔ کسی کو مندیل ملی۔ کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفا اور امرا مجرا بجا لائے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولیعہد بہادر نیچے اتر آئے لوگوں کے گلے میں پھولوں کے کنٹھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہونگے کہ پنکھا جوگ مایاجی پہنچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے بڑی لمبی چار دیواری۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر بیس بائیس عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی

کی بہن تھیں۔ بجلی بن کر الوپ ہوگئیں اور یہاں آپڑیں۔ راجہ یدھشٹر نے مندر بنوادیا۔ مندر زمین کے برابر ہوگیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایماسے لالہ سیدھول نے نیا مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں اب یہ خاصی آباد جگہ ہوگئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پلنگ یا چارپائی نہیں جاسکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھاکر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ بابِ ظفر کے سامنے آکے ٹھہرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کہا "اماں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جب میں جوگ مایاجی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا۔ تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمہارے ہندو بھائی کیا خیال کرینگے۔ کہینگے مسلمان تھا مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہوگیا۔ ہم کو غیر سمجھا۔ اس لئے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آئے۔ نا۔ اماں۔ نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے۔ اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں۔ وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر۔ درگاہ شریف تو قریب ہی تھی۔ لوگ ۱۰ بجے پنکھا چڑھاکر

فارغ ہو گئے اور یہاں سے نکل کر سیدھے شمسی تالاب پہنچے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ بیگمات کے جہاز پر چلمنیں پڑ گئیں وہ اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبوں اور دہلی کے اکثر اُمراء و شرفاء کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سینکڑوں کشتیاں، بجرے اور نواڑے پہلے ہی پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں شاہی آتشباز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا۔ کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھُٹی۔ مہتابی کا چھُٹنا تھا کہ میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے گئے اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جنگی آتشبازی[1] کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2]۔ چھکے[3]۔ لٹو اور ٹھنتگے[4] چلے۔ ہوائیوں کی شائیں شائیں چھکوں کی غائیں غائیں۔ لٹوؤں

[1] دہلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسری گل کاری۔ ان دونوں کا مطلب آگے خود آپ سمجھ جائیں گے۔ [2] بڑے اُڑن اناروں کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں [3] موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ، اوپر سے جھلی چڑھا۔ اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چھکہ بنایا جاتا ہے۔ اس کا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے کر اسکو ہلانا شروع کیا جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دے کر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ بیچا رہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو قیامت آگئی کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا کسی کے کپڑوں میں آگ لگی۔ غرض یہ آتشبازی کیا ہے اک بلا ہے۔ [4] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے

(بقیہ دیکھو صفحہ آئندہ)

کی دھائیں دھائیں۔ خدنگوں کی زائیں زائیں اور قلموں[۱] کی سائیں سائیں میں سے
بس یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ اِدھر آسمان پر مقابلہ
ہو رہا تھا۔ اِدھر پانی پر آتشبازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے
چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں اور چھچھوندریں گولوں
کی جگہ چکر اور خدنگے بندوقوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی
پیٹ میں بارود ناف میں چھچھوندر۔ اِس سرے سے اُس سرے
تک شتابہ کا سلسلہ۔ اِدھر سے دلی والوں کے بجرے چلے اُدھر سے
قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچکر دھواں دھوں
ہونے لگی۔ سمندر کی لڑائی کا مزا آگیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا
تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے۔ اور پانی میں روشنی کے
عکس کشتیوں کے سائے۔ آتشبازوں کے ننگے ننگے جسم کناروں پر
خلقت کے ہجوم۔ ان کے غل۔ آتشبازی کے عکس سے ان کے
زرد چہروں اور اوپر دھوؤں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک
منظر پیدا کر دیا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۷) گولے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ چلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا لٹو کو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی۔ ۵ خدنگ کو دہلی والے خدنگہ کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔

[۱] بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں پانی کی چوٹ کھا کر بھی اُلٹتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اُڑ جاتی ہے۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیوں۔ آفتابیوں، اناروں، سہروں۔ لٹوؤں ہت پھولوں اور چرخیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آگئیں۔ یہاں اُستادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ نسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ کر سَو سَو دفعہ اٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ بتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں اور پچ رنگی پھول دیں۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتھیلی پر چھوڑ لو۔ کیا مجال کہ جو جرکہ لگے۔ بڑے انار جو اٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان میں سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانیں۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبہ نہ دیں۔

آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے۔ اور اس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نے تالاب میں آتشین باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال دوشالے۔ مندیلیں اور سیلے تقسیم ہوئے کہیں تین بجے جا کر لوگوں کو فرصت ہوئی۔ سب اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی اور روشن چراغ[1] دہلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آگئی

[1] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا مزار پُرانی دہلی میں ہے قطب سے ۵ میل (دیکھو صفحہ آئندہ پر)

دوسرے روز لوگوں نے صبح ہی صبح اُٹھ میوے مٹھائیاں پڑاٹھے[1] چھلّے[2] اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہوگئی۔

(مضامین فرحت حصّہ دوم)

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

اور دہلی سے تقریباً ۷ میل۔ آپ کو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہاں آپ کا مزار ہے اس بستی کو اُسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہیں۔

[1] پھول والوں کی سیر کی بس دو ہی سوغاتیں تھیں۔ ایک پراٹھے۔ دوسرے چھلّے آتے اور گھر گھر بٹتے۔

مشق کے لئے سوالات

۱ - میر امن نے چہار درویش کی سیر میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو اب متروک ہیں۔ ایسے الفاظ کی فہرست بناؤ اور ان کے سامنے وہ لفظ لکھو جو ان کی جگہ آج کل عام طور پر بولے جاتے ہیں۔

۲ - "آدمی کا شیطان آدمی ہے"۔ کیا تمہیں اس سے اتفاق ہے۔ وجہ لکھو اور مثالیں دیکر سمجھاؤ۔

۳ - غالب کے خطوں میں کیا خاص بات ہے ان کے خطوں سے مثالیں دیکر بتاؤ۔

۴ - غالب نے اپنے خطوں میں جو حال ۱۸۵۷ء کے متعلق لکھا ہے۔ اسے مضمون کی صورت میں لکھو۔

۵ - نذیر احمد کے لکھے ہوئے مضمونوں میں جسقدر محاورے استعمال ہوئے ہیں وہ ایک جگہ جمع کرو - اور ان کا مطلب لکھو۔

۶ کسی افسر سے اپنی ملاقات کا حال لکھو۔

۷ - کیا تم نے علیم کی طرح کسی سے نیک سلوک کیا ہے - اسے اپنے لفظوں میں بیان کرو۔

۸ - ابن الوقت کی طرح تمہیں کبھی کسی نئے کام کو کرنے کا اتفاق ہوا ہے یا تم نے کسی کو ایسا کام کرتے دیکھا ہے جو وہ نہیں جانتا - اور لاعلمی

سے بہت سی غلطیاں کرتا ہے ۔اس کی تفصیل لکھو۔

۹ مرزا غالب کی زندگی کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔ مضمون کی شکل میں لکھو (اگر ممکن ہو تو اپنی کتاب کے علاوہ یادگار غالب اور آبِ حیات میں غالب کے حالات بھی پڑھو)

۱۰۔ جس طرح حالی نے اپنی کہانی لکھی ہے تم بھی اپنی زندگی کے مختصر اور ضروری حالات لکھو۔

۱۱ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" اس مضمون کو مختصر طور پر اپنے لفظوں میں لکھو۔

۱۲۔ اکبر کی شجاعت اور بہادری کا حال چند مثالیں دیکر لکھو (اس مضمون کے علاوہ اپنی تاریخ کی کتاب سے بھی مدد لو)

۱۳۔ خان خاناں کی زندگی کے حالات پڑھکر تم کو کیا بات سب سے زیادہ پسند آئی۔ اور کیوں؟

۱۴۔ پُرانے زمانے میں اتالیق کے لئے کن کن شرطوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا اور کیوں؟

۱۵۔ سرشار نے اپنے مضمون میں جو محاورے لکھے ہیں ان کو ایک جگہ لکھکر اپنے لفظوں استعمال کرو۔

۱۶۔ میاں آزاد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ان کا کیرکٹر اپنے لفظوں میں لکھو (اگر ہو سکے تو فسانہ آزاد کے اور دلچسپ حصے بھی پڑھو)

۱۷۔ ابن بطوطہ کا سفر اپنے لفظوں میں لکھو۔

۱۸- اپنے کسی سفر کا حال ابن بطوطہ کے انداز میں بیان کرو۔
۱۹- لکھنؤ کے رکابدار کیوں مشہور تھے۔ ان کا کوئی کمال یاد ہے تو لکھو
۲۰- لکھنؤ کے رکابدار کون کون سے کھانے تیار کرتے تھے۔ انکی فہرست بناؤ اور اگر ممکن ہو تو کسی سے پوچھ کر ان کھانوں کا کچھ حال بھی لکھو۔
۲۱- تاریخ نویسی کی کون کون سی منزلیں چک لبست نے بیان کی ہیں۔ ان منزلوں کی تفصیل لکھو۔
۲۲- کیا تمہیں تاریخ سے دلچسپی ہے۔ تاریخ کے کیا کیا فائدے ہیں۔
۲۳- کسی میلہ کا حال "پھول والوں کی سیر" کے انداز میں لکھو (مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کتاب کی صورت میں چھپ گئے ہیں ان میں اس سیر کا پورا حال موجود ہے۔ اگر ممکن ہو تو یہ مضمون بھی پڑھو)

نوٹ :- یہ چند سوالات صرف نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ طلبا اس نصاب کو پڑھنے کے علاوہ ساتھ ساتھ لکھنے کی مشق بھی کرتے رہیں۔ اور یہ مشق کوئی خشک صورت اختیار نہ کرے بلکہ نفس مضمون میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر انہیں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ڈھنگ بھی آجائے۔ اسی قسم کے اور زیادہ دلچسپ سوالات استاد خود بنا سکتے ہیں اگلے صفحہ پر اردو کے مشہور مصنفوں کی چند کتابوں کی فہرست لکھی جاتی ہے اگر ممکن ہو سکے تو استاد طلباء کو خالی وقت میں یہ کتابیں ضرور پڑھوائیں۔

اُردُو کی چند مشہور کتابیں

میر امّن - چہار درویش -

غالب - اردوئے معلّٰی - عودِ ہندی - دیوانِ غالب -

نذیر احمد - ابن الوقت - توبۃ النصوح - مراۃ العروس - بنات النعش -

حالی - یادگارِ غالب - حیاتِ جاوید - حیاتِ سعدی - مقدمۂ شعر و شاعری - دیوانِ حالی
مسدّسِ حالی -

آزاد - آبِ حیات - دربارِ اکبری - نیرنگِ خیال حصہ اوّل و دوم - قصصِ ہند حصہ دوم -
نظمِ آزاد -

سرشار - فسانۂ آزاد چار حصّے - خوجی کے کارنامے آٹھ حصّے -

شرر - مضامینِ شرر آٹھ حصے - حسن بن صبّاح - فردوسِ بریں -

چکبست مضامینِ چکبست - صبحِ وطن -

مرزا فرحت اللہ بیگ - مضامین فرحت پانچ حصّے - دہلی کا ایک تاریخی مشاعرہ

منشی پریم چند - پریم پچیسی - پریم بتیسی - میدانِ عمل - آخری تحفہ - زادِ راہ -
بیوہ - گوشۂ عافیت -

فہرست مضامین

نظم

جس طرح کہ روزمرہ تم باتیں کرتے ہو اسے نثر کہتے ہیں۔ مثلاً تم سے کہا جائے کہ دنیا میں ادھر ادھر تمہیں خدا کا ہی جلوہ دکھائی دیگا۔ یہ نثر ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں:۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بات وہی ہے۔ لفظ بھی تقریباً وہی ہیں لیکن تم ذرا اسے غور سے پڑھو تو ایک بات صاف طور پر معلوم ہو جائے گی کہ لفظوں کو آگے پیچھے کرنے سے اِن دونوں سطروں میں ایک مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ اس مناسبت کا دوسرا نام موزونیت ہے یعنی اگر کہنے والا کلام میں وزن پیدا کر دے تو اس کلام موزوں کا دوسرا نام نظم ہے۔

ہر شعر کے دو حصّے ہوتے ہیں جن میں سے ہر حصّے کو مصرعہ

کہتے ہیں۔

تم اپنی کتاب کے حصّۂ نظم کے پہلے صفحے کو دیکھو۔ اس پر وہی شعر ملیگا۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دونو مصرعوں کے آخر میں اُدھر دیکھا۔ جدھر دیکھا ہے گویا دیکھا دونوں میں ہے۔ اور دیکھا سے پہلے ایک مصرعہ میں اُدھر۔ دوسرے میں جدھر ہے۔ ادھر اور جدھر وزن کے اعتبار سے ایک جیسے لفظ ہیں۔ انھیں قافیہ کہتے ہیں اور دیکھا کو ردیف۔ ردیف ہمیشہ قافیہ کے بعد آتی ہے۔

اسی نظم کے دوسرے اشعار دیکھو تو ان کے دوسرے مصرع میں اُدھر اور جدھر کے وزن پر دوسرے الفاظ ملیں گے۔ جیسے بھر دیکھا کر دیکھا۔ مَر دیکھا وغیرہ۔ ان سب شعروں میں گویا بھَر۔ کَر اور مَر تو قافیہ ہے اور دیکھا ردیف ہے۔ ایک غزل میں ردیف کا لفظ نہیں بدلتا

نظم کی کتنی قسمیں ہیں۔ دوسری قسموں کا تو بعد میں ذکر ہوگا سب سے پہلے غزل کی تعریف سُن لو۔

عربی میں غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل ایسے ہم قافیہ اور ہم ردیف اشعار کا مجموعہ ہے کہ جن میں عموماً معشوق کے حسن۔ دلربائی عشق۔ عشق کی دیوانگی۔ عاشق کے

جذبات۔ وصل و فراق وغیرہ کا ذکر بہت لطیف اور نازک پیرائے میں کیا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد پانچ سے لے کر پندرہ یا سترہ تک ہوسکتی ہے۔ یہ شاعر کی مرضی پر ہے کہ جسقدر چاہے ہم قافیہ وہم ردیف شعر غزل میں جمع کردے لیکن ان اشعار کی تعداد ہمیشہ طاق ہوتی ہے یعنی تین یا پانچ یا سات یا نو یا گیارہ۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار میں دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ صرف ہر شعر کے دوسرے مصرعہ میں وہی ردیف اور وہی قافیہ لایا جاتا ہے جو غزل کے مطلع میں استعمال ہوا ہے۔

عموماً غزل کا ہر شعر مطلب کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے یعنی صرف ایک شعر پڑھنے سے ہی سارا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے بعض دفعہ شاعر دو یا تین شعروں میں مطلب ادا کرتے ہیں ایسے اشعار مسلسل پڑھنے سے مطلب سمجھ میں آتا ہے انھیں قطعہ کہتے ہیں اور علامت کے طور پر ان کے شروع میں ق لکھ دیتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر جس میں کہ شاعر عام طور پر اپنا تخلص لاتے ہیں مقطع کہلاتا ہے۔

سوالات

۱۔ شعر کسے کہتے ہیں؟

۲۔ قافیہ۔ ردیف۔ مطلع اور مقطع کی تعریف کرو۔

۳۔ غزل کے کیا معنی ہیں اور اصطلاحی طور پر اسے ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے؟

غزلیات

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ، فریاد، آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

اِن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور[۱] عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصّہ مختصر دیکھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی ہم سے اے ہم صفیرو[۲]
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

---

[۱] بہت زیادہ۔ [۲] مرے ساتھ کا گانے والا۔

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

دیکھیے غم سے اب کے جی میرا
نہ بچیگا۔ بچے گا۔ کیا ہوگا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غمزدہ کا جس جس نے
جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں
بن کیے آہ کم رہا ہوگا

لیکن اس کو اثر خدا جانے
نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں
جان اپنی جو کوئی کر گذر جاتے ہیں

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

بعضے ہر دشمنیٔ اہلِ ہنر سے آ کر
منہ پہ چڑھتے تو ہیں پر دل سے اتر جاتے ہیں

آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثر[2] جاتے ہیں

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

[1] سلامت [2] یہاں اثر کے دو معنی ہیں ایک تو اپنا نشان۔ دوسرے درد کے چھوٹے بھائی کا تخلص اثر تھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشمِ تر[1] آئے تھے دامن تر[2] چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اسکو[3] پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لیکر چلے

جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر[4] چلے

درد

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

---

[1] روتے ہوئے۔ [2] گنہگار۔ [3] خدا کو۔ [4] کیدھر کی جگہ اب کدھر بولتے ہیں۔

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل — سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں — جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں — جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے — جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو — تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا — کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

تھا ناز بہت ہم کو دانست پہ اپنی بھی — آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

کیا پانی کے مول آکر مالک نے گہر بیچا — ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

۱؎ یعنی دل ہمارے ۲؎ خود ۳؎ انسان ۴؎ رونا ۵؎ پلکوں۔

اے شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

دیکھ تو دل سے جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسماں سے اٹھتا ہے

بیٹھنے دے ہے کون پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

عشق میر ایک بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب[1] کی سی ہے

چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

آتشِ غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میر

---

[1] سراب: صحرا میں ریت کا وہ حصہ جو دور سے بہتا ہوا پانی نظر آتا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری[1] راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں[2] کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے نہ پاؤں تو پھیلا

نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس گلِ رعنا[3] کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا

---

۱ بہار کی ہوا کی خوشبو ۲ شریف ۳ خوبصورت پھول۔

بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
ایک دشمن کہ چرخ ہی نہ رہے — تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں — کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
کیسی حیرت ہے اے سبک روحی — دیکھے ہے دیدۂ حباب ہمیں
وہ جفاکش ہیں اے فلک کہ کیا — اُس ستمگر نے انتخاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس — موت نے بھی دیا جواب ہمیں

اے تپِ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

بات ناصح سے کرتا ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

اے قیامت نہ آئیو جب تک
وہ مری گور پر نہ ہو جائے

مومن ایمان قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

مومن

لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرس[۱] ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

---

۱ گھنٹی۔

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا
سُراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا
فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو — نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

نظیر[۱] اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

جینا ہمیں اصلاً[۲] نظر اپنا نہیں آتا — گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں — جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا
دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے — آ جاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق[۳] مجھے کیا نہیں آتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا — نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا — اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا — کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

۱ اس جیسا۔ ۲ بالکل ۳ بے نظیر۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کر شراب و کباب کی باتیں

مجھ کو رُسوا کرینگی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

نہ سمجھو دشت شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط[1] پہ ہم جیسے بد قمار[2]
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

---

[1] شطرنج کھیلنے کا کپڑا۔ یہاں دنیا سے مراد ہے۔ [2] بہت برے جواری۔

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہی ہو — دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ — تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

ذوقؔ

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرودؔ[1] کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

---

[1] ایک قدیم بادشاہ کا نام جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ آخر اس پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد / پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں / ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی / کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی / موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے / آخر اس درد کی دوا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں / کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید / جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا / اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے / نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے / پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی / ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد / مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

لے خدا سے شہد۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر[2] نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

غالب

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں — لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی — پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی — آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
سُن سُن کے سر دھنیں گے قالِ اہلِ حال تیرا

---

[1] حضرت عیسیٰ جو مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ [2] خضر اور سکندر کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جبکہ خضر نے سکندر کو آبِ حیات تک پہنچانے کی حامی بھری اور بعد میں اُسے راستہ بھٹکتا چھوڑ دیا۔

دیکھ اے امید کیجیو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

دنیا کے خرخشوں سے بیچ اُٹھے تھے ہم اوّل
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اُس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے پر یار ہے تمہارا

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

کہتے ہیں جسکو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظروں میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب سب حوانیاں ہیں

رونے میں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصّہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

عاد سے تا ثمود جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی انکی نشانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

[1] فرماں بردار [2] مشرق [3] مغرب۔

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خون فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

جہاں کام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت ہے اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت ہم یاں زمانے کے ہاتھوں
جو دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ ڈہریت زیادہ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ چمن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرینِ چمن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

حالی

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں
مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

بہارِ گل میں دیوانوں کا صحرا میں پڑا ہوتا
جدھر اٹھتی نظر کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا

مے گلرنگ لٹتی یوں در میخانہ وا ہوتا
نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گلہ ہوتا

رُلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جدا ہوتا

خدا کو بھول کر انسان کے دل کا یہ عالم ہے
یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خارِ تمنّا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گِلا ہوتا

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پہ
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

یہاں بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
اگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

چکبست

قطعات

غزل کے مسلسل اشعار کہ جن کے معنی ایک شعر سے نہیں بلکہ کئی اشعار کو ملا کر سمجھ میں آتے ہیں قطعہ کہلاتے ہیں۔ ہر ایک قطعہ میں غزل کی طرح ہر شعر کے دوسرے مصرعہ کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ قطعہ کے لئے تعداد اشعار کی کوئی قید نہیں ہے۔ بعض دفعہ صرف دو شعروں کا قطعہ ہوتا ہے۔ اور کبھی بیس بیس شعر تک ہوتے ہیں۔ عام طور پر شاعر قطعات میں اخلاقی مضمون یا نصیحت نظم کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف انہی مضامین پر اکتفا کیا جائے بعض شاعروں نے قطعات میں عاشقانہ مضامین بھی باندھے ہیں۔

سوالات

۱۔ قطعہ اور غزل میں کیا فرق ہے؟

۲۔ مزا کے ہم قافیہ الفاظ جس قدر تم کو آتے ہوں لکھو۔

شیشۂ دل

جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہِ مینا میں — دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گرو! ہے شیشہ

کہنے اگلے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست — ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز — شکل شیشے کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

انجامِ ہستی

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

سب دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں

بے زری کا نہ کر گلا غافل — رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اتنے منعم جہان میں گذرے — وقتِ رحلت کسی کنے زر تھا

صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال — یک از آں جملہ اب سکندر تھا

تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں! — ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا

لعل و یاقوت و ہم زر و گوہر — چاہیے جس قدر میسر تھا

آخر کار جب جہاں سے گیا — ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

۱؎ لگے۔ ۲؎ پگھلا کر۔ ۳؎ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ۴؎ امیر

اشرف المخلوقات

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اسکے واسطے ہے مدام — ہو گیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید ابر و باد سبھی — اسکے خاطر ہوئے ہیں شیدائی
کیسے کیسے کیے تردد جب — رنگ رنگ اس کو چیز پہنچائی
اسکو ترجیح سب کے اوپر دی — لطف نے کی یہ عزت افزائی
حیرت آتی ہے اسکی باتیں دیکھ — خود سری، خود ستائی، خود رائی
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا — یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی

میر

ابر کی آمد

لہرا دیا صبا نے جو کل سبزہ زار کو — دو ہیں گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو
جوش خروش رعد نے یہ صوم دھام کی — ہرگز کوئی کسی کی نہ پہنچا پکار کو
بجلی تڑپ تڑپ کے دکھانے لگی چمک — رونق ہوئی دو چند ہر اک برگ و بار کو
کچھ لاکھا ہائے ابر سپید و سیاہ و سرخ — مستانہ جھوم جھوم چلے کوہسار کو
ہم مشرب اپنے چند جواں تھے جو نہر پہ — تشریف لے گئے وہ لب جوئے خشکار کو

انشا

۱؎ حرکت کر رہا ہے

ترکِ دنیا

کل اک تارکِ[1] دنیا سے میں نے پوچھا ذوقؔ
کہ تو اُکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہوا پیوست[2]

گذرتی ہوگی بآرام زندگی تیری!
کہ تجھ کو اب نہ غمِ نیست ہے نہ شادیِ ہست[3]

کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انسان
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست[4]

اٹھائے ہاتھ جہاں سے و لیک کیا امکان
کہ بافراغ کروں کنجِ عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
سلسلے میں فقیری کے پھر ہوا پابست[5]

رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست

کہ ایک عمر میں پہنچا [illegible] اصلی پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست

جو دست گاہ تصوف میں بھی ہوئی اُس کو
تو یہ ارادہ رہا اور بھی ہو بالا دست

---

[1] جس نے دنیا بالکل چھوڑ دی تھی [2] جا لا [3] مال کی خوشی [4] روزِ ازل سے [5] آزاد شدہ قید

ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کُل کے بھی
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجئے شکست

جو ہوشیار ہے تو شرع کا ہے وہ پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست

نہیں ہے دامِ علائق[1] سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست

[2] کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
برید زہمہ باخدا گرفتار است

ذوق

احوالِ شبِ ہجر

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر
نہ تھی شب خال رکھا تھا اک اندھیر[3]
شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے

کہ تھی اک اک گھڑی ستو ستو مہینے
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
کہ اوے مہر یداختر گینے

[1] تعلقات کا جال [2] دنیا سے اپنا تعلق کون قطع کر سکتا ہے۔ جو سب چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے وہ خدا کی محبت میں پھنس جاتا ہے۔ [3] اندھیرا۔

کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردے میں کہ ظالم — اے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یٰسین[۱] سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یُمن و فرخی[۲] نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خودخوشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

---

[۱] قرآن مجید کی ایک سورت جو مرنے کے وقت مسلمان مریض کو سنائی جاتی ہے [۲] خوش نصیبی۔

آمد بہار

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

غالب

شاعر کی دنیا

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

عارفؔ[1] کی موت

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

[1] فوت کرنے والی سند ... جب غالب کو اپنے اولاد کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو اپنی بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف کو متبنیٰ بنا لیا [illegible] بہت محبت کرتے تھے۔ عارف جوانی میں مر گئے یہ قطعہ اسی موقع پر کہا تھا۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف[۱]
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد[۱] کے
کرتا ملک الموت[۲] تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

شاعر کا دل

اُٹھا اک دن بگولا سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر[۳] گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے

نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ[۴]
پٹکتا تھا سرِ شوریدہ[۵] دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ او ناکام آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

---

۱ یعنی دین ۲ موت کا فرشتہ ۳ پریشان ۴ پر بندھا ہوا زخمی پرندہ۔
۵ دیوانہ۔ ۹+۱۰ غالب کا بھتیجے۔

ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں[1] بہی پلکوں کے داماں سے

کہاں میں صید[2] ہوں اسکا کہ جس کے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغ رضواں[3] سے

اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشم غور جو دیکھا مرا ہی طائر دل تھا
کہ جل کر ہو گیا تھا خاک اپنی آہ سوزاں سے

غالب

دہلی مرحوم کا تذکرہ

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستان گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیاح[4]
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا[5] تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

---

[1] خون کی ندی [2] شکار۔ قیدی [3] جنت [4] سیر کرنے والا [5] بے مثال

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب[1] و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائیگا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

احتساب نفس

کرتے ہیں سَو سَو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو ہر سبز گار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر

اپنی نیکی کا لاتے ہیں یقین
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

---

[1] یہ سب دہلی کے مشہور شاعروں کے نام ہیں جو اس وقت انتقال کر چکے تھے
[2] داغ اور مجروح دہلی کے وہ شاعر اس وقت زندہ تھے جبکہ یہ قطعہ کہا گیا تھا۔

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم ۔ کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر
کی نہیں جس نے کبھی کوئی بدی ۔ شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر
ایک لغزش میں بھلا دیتے ہیں سب ۔ ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احسان اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو ۔ جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح[1] تاکہ ہو ۔ عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست ۔ ایسے یاروں سے حذر[2] یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر

حالی

بدی کر کے نیکنامی کی توقع رکھنی

نا منصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم ۔ برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورہ کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جاکر ۔ تھا پوچھتا ہر ایک سے ازراہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا ۔ کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
تھی اُس کی مثال ایسی کہ اک شخص پئے آواز ۔ جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنے کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے ۔ ہر بار لپکتا تھا بعد تیزی و سرعت
ہوتا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری ۔ آواز خوش آئندہ[3] و یا قابلِ نفرت

حالی

---

[1] نصیحت کرنے والا [2] ڈرنا چاہیے ۔ [3] میٹھی آواز جو کانوں کو بھلی لگے۔

قدیم وضع اور طرزِ جدید میں لڑائی

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید[1] یہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا

جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

اِدھر یہ ضد ہے کہ لمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا

اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت نایاب
اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض[2] دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

اکبر

مشرق اور مغرب کا فرق

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں!

اِدھر ہے قوم ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں[3]
یا اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

---

[1] اشارہ سرسید مرحوم کی طرف ہے جو مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔ [2] غرض کہ مجنوں کی جان عجب مصیبت میں ہے۔ اگر لیلا کے پاس بیٹھتا ہے تب مشکل ہے۔ اور اگر لیلا سے دور رہتا ہے تب مصیبت ہے۔ [3] خود غرض لیڈر۔

کٹی رگِ اتحادِ ملت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اُس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہار سے ہیں نکھر رہے ہیں
صدائے الحادؔ اُٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اُٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا سینے پڑے ہیں کچھ داہنلے شیر ہیں
اسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پَر رہے ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی رہی بلا ہے
خیالِ نیچرؔ کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشنؔ رکا ہے ملحدؔ کا اپریشن !
نہیں ہے کم لفظ سالویشنؔ خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے مزار گپ ہے وہاں وہی عزتِ بشپؔ ہے
یہاں مساجد اُجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جنابِ اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
ہیں انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

---

۱ خدا کی ہستی سے انکار کرنا ۲ جا بجا ندی کا تجربہ ۳ نیچر انگریزی میں مادّے کو کہتے ہیں۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کا بنانے والا خدا نہیں ہے بلکہ یہ ایک مادہ ہے جو خود بخود وجود میں آگیا ہے ۴ نیشن انگریزی لفظ معنی قوم ۵ خدا کو نہ ماننے والا ۶ نجات مکتی ۷ پادری ۸ گرجا۔

جدید تعلیم

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا
وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائیگا جوبن پیدا

وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر
ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

پستیٔ قوم کے جب آ گئے دن اے اکبر
اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا

اکبر

میں نے اکبر سے کہا دیکھ کے اُسکو مسرور
اس چٹائی پہ نمازیں ہیں حسب دستور

چھوڑیئے آپ یہ ہنگامہ تعلیم جدید
کاٹ ہی دیگا کسی طرح خداوند غفور[1]

بولا جھنجھلا کے کہ ہے ہولِ جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

سناؤں تم کو اِک فرضی لطیفہ
کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس[2]

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

اکبر

---

[1] معاف کرنے والا [2] کاغذ پر لکھا ہے۔

پردہ
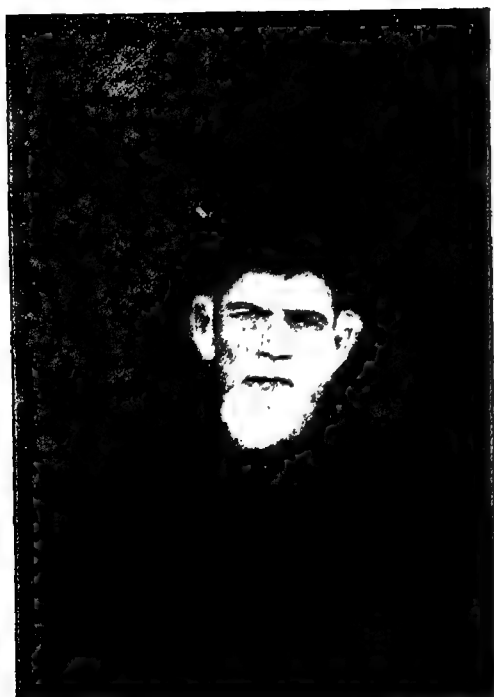
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل[1] پہ مَردوں کی پڑ گیا

اکبرؔ

ہندو مسلم اتحّاد

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی — اپنی اپنی رَوِش[2] پہ نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر[3] پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اکبرؔ

شاعر کی آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت[4] میں دن گذاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذّتِ سرود[5] کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

[1] عقل پر پردہ پڑجانا یعنی عقل کھو دینا [2] طریقہ [3] زمانہ [4] تنہائی۔ [5] گانا۔

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما[1] ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اسقدر ہو صورت سے میری بلبل — ننھے سے دل میں اُس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو — سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے — جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن — میں اُسکا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جسدم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

اِس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

اقبال

سرگذشت آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے — بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے

[1] دنیا دکھانے والا۔ اشارہ ہے جمشید کے پیالہ کی طرف جس میں وہ تمام دنیا کا حال دیکھ سکتا تھا۔

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبہ سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور[1] پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب[2] پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا[3] میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سنایا ہند[4] میں آ کر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ یونان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلہ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقل دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں[5] میں نے

[1] اشارہ حضرت موسیٰ کی طرف جو طور پر خدا سے باتیں کرنے گئے تھے اور خدا نے انھیں یدِ بیضا کا معجزہ عطا کیا تھا۔ [2] حضرت عیسیٰ کو صلیب پر لٹکایا تھا [3] حضرت محمد صاحب غارِ حرا میں جا کر عبادت کرتے تھے [4] ہندستان میں مہاتما بدھ نے مذہب کی تبلیغ کی۔ [5] فتح کرنا۔

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے
اقبال

ذی حیات مناظر

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے

بھینی بھینی سی مہکتی ہے فضا میں خوشبو
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ ساحل سے ہوا آتی ہے

دشتِ خاموش کی اُجڑی ہوئی راہوں سے مجھے
جادہ پیماؤں کے قدموں کی صدا آتی ہے

مسکراتی ہے جو ذرہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے

کرنے لگتے ہیں نظارے سے جو بادل یوں
برق آہستہ سے کچھ کان میں کہہ جاتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

گنگناتے ہوئے میدان کے سناٹے میں
آپ ہی آپ طبیعت مری بھر آتی ہے

یوں نباتات سے چھوتی ہوئی آتی ہے صدا
دل میں ہر سانس سے اِک پھانس سی چبھ جاتی ہے

جب ہری دوب کے مرجاتے ہیں نازک ریشے
شیشۂ قلب میں اِک ٹھیس سی لگ جاتی ہے

بانسری جیسے بجاتا ہو کہیں دُور کوئی
یوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے

حسرتیں خاک کی غنچوں سے اُبل پڑتی ہیں
رُوح میدان کی پھولوں سے نکل آتی ہے

طبع شاعر کو روانی کا اشارہ کر کے
نہر شاخوں کے گھنے سائے میں سو جاتی ہے

ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیونکر
جوشؔ کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

ـــــ
بجلی۔ ایک قسم کی گھاس۔

مثنوی لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی دو کے ہیں۔ چونکہ مثنوی کے ہر شعر کے دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر قافیہ کے لحاظ سے دوسرے شعر سے جدا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے مجموعہ کو شاعری کی اصطلاح میں مثنوی کہتے ہیں۔

مثنوی میں عموماً کوئی قصہ یا واقعہ نظم کیا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے مثنوی موزوں بھی ہے۔ کیونکہ شاعر کو ایک ہی قسم کے ہم قافیہ اور ہم ردیف الفاظ کی تلاش میں کاہش کرنی نہیں پڑتی۔ فارسی زبان میں شاہنامہ اور مثنوی مولانا روم بہت مشہور ہیں۔ اُردو شاعری میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور نسیم لکھنوی کی گلزار نسیم کو بہت شہرت حاصل ہے

سوالات

۱۔ مثنوی کے لفظی اور اصطلاحی کیا معنی ہیں؟

۲۔ مثنوی اور غزل میں کیا فرق ہے؟

داستان تیاری میں باغ کے

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی دور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ[1] پہ خوبی سے لٹکا ہوا

وہ قیش کی ڈوریاں سربسر — کہ مہ کا بندھا جس میں تار نظر

چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گذرنا محال

سنہری مغرق[2] چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گلکاریاں

دئیے ہر طرف آئینے جو لگا — گیا چوگنا لطف اس میں سما

وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں لخلخے[3] اس میں روشن مدام — معطر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں — چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پہ چمک

زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں — کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر — گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اس کے سرو سہی — کچھ اک دور دور اس سے سیب بہی

---

[1] دیوار کی وہ ابھری ہوئی اینٹیں جو خوبصورتی کے طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔ [2] سونے میں غرق [3] کئی خوشبوئیں ملا کر اور قندیل کے معنی میں بھی آتا ہے۔

ہوائے بہاری سے گُل لہلہے | چمن سارے شاداب اور تھے ہرے
زمرد کی مانند سبزے کا رنگ | روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار | گُلِ اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے بھرا باغ گُل سے چمن | کہیں نرگس و گُل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا | کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخِ شبّو کے ہر جا نشان | مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار | جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں | سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گُلوں کی بہار | ہر اک گُل سفیدی سے مہتاب وار
کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ | کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن | عجب رنگ کے زعفرانی چمن!
پڑے آبِ جو ہر طرف کو بہے | کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گُلوں کا لبِ نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پہ | نشے کا سا عالم گلستان پہ
لئے بیلچے ہاتھ میں مالنیں | چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں
کہیں تخم پاشی کریں گود کر | پنیری جمادیں کہیں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال | رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
لبِ جو پہ آئینے میں دیکھ قد | اکڑنا کھڑے سرو کا جد[۱] و تد

۱ جب اور تب۔

خراماں صبا صحن میں چار سُو | دماغوں کو دیتی ہر اِک گُل کی بُو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے | لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطو لکا وہ شور | درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گُل سے دہکا ہوا | ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول | پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں | لگیں جائیں آنکھیں لئے جھپکا ناؤں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں | تعشق کی آپس میں باتیں کریں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق | کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق!

داستان سواری کے تیاری کے حکم میں

کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام | کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
سواری تکلف سے تیار ہو | مہیا کریں جو کہ درکار ہو
کریں شہر کو مل کے آئینہ بند | سواری کا ہو لطف جس سے دوچند
رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر | کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
یہ فرما محل میں گیا بادشاہ | نقیبوں نے سُن حکم لی اپنی راہ
ہوئی شب لیا مہ نے جام شراب | گیا سجدۂ شکر میں آفتاب
خوشی میں گئی جلد شب جو گذر | ہوئی سامنے سے نمایاں سحر
عجب شب تھی وہ جوں سحر رسید | عجب بعد تھا شل روزِ اُمید

[1] قطاریں [2] چھوٹے بڑے [3] شاہزادے کا نام۔

گیا مژدۂ صبح لے ماہتاب　　اٹھا سورج آنکھوں کو ملتا شتاب
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو　　کہ با نہا دھو کے تیار رہو
نہا دھو کے نکلا وہ گل اسطرح　　کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جسطرح
غرض شاہزادے کو نہلا دھلا　　دیا خلعتِ خسروانا پنھا
جواہر سراسر پنھایا اُسے　　جواہر کا دریا بنایا اُسے
کڑے کنگن اور کلغی اور نورتن　　کیا ایک سا ایک زیبِ بدن
مرصع کا سرپیچ جوں موجِ آب　　منور بہ شکلِ رخِ آفتاب
وہ موتی کے مالے بصد زیب و زین　　کہیں جس کو آرام جانِ دل کا چین
جواہر کا تن پر عجب تھا ظہور　　کہ اک اک عدد اسکا تھا کوہِ طور
غرض ہو کے اسطرح آراستہ　　خراماں ہوا سروِ نوخاستہ
نکل گھر سے جبدم ہوا وہ سوار　　کئے خوان گوہر کے اُس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم　　ہوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار　　ہزاروں ہی تھی ہاتھیوں کی قطار
سنہری رُپہلی وہ عماریاں　　شبِ روز کی سی طرحداریاں
چمکتے ہوئے بانے کے نشان　　سواروں کے غٹ اور بانوں کی شان
ہزاروں ہی اطراف میں پالکی　　جھلا بور کی جگمگی نالکی
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں　　اور اُن کے دوبے پاؤں کی پھرتیاں
بندھیں پگڑیاں تاش کی سر اوپر　　چکا چوند میں جس سے آوے نظر

ملہ چمک دار۔

وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے ۔۔۔ جھلک جن کی ہر ہر قدم پر پڑے
وہ ماہی مراتب[1] وہ سرو بڑاں ۔۔۔ وہ نوبت کا دولہا کا جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما ۔۔۔ سہانی وہ نوبت کی آوے صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی ۔۔۔ قدم با قدم بالباسِ زری
بجاتے ہوئے شادیانے تمام ۔۔۔ چلے آگے آگے ملے شادکام
سوار اور پیادہ صغیر اور کبیر ۔۔۔ جلو میں تمامی امیر اور وزیر
وہ نذریں کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں ۔۔۔ شہ و شاہزادے کو گذرانیاں
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار ۔۔۔ چلے سب قرینے سے باندھے قطار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام ۔۔۔ لباسِ زری میں ملبس تمام
طرق[2] کے طرق اور پرے کے پرے ۔۔۔ کچھ ادھر ادھر کچھ ورے کچھ پرے
مرصع کے سازوں سے کوتل[3] سمند ۔۔۔ کہ خوبی میں روح القدس[4] سے دوچند
وہ فیلوں کی اور میگھ ڈنبر[5] کی شان ۔۔۔ جھلکتے وہ مقیش کے سائبان
چلے پایۂ تخت کے ہو قریب ۔۔۔ بدستور شاہانہ لیتے جریب
سواری کے آگے بڑا اہتمام ۔۔۔ لئے سونے روپے کے خاصے تمام
نقیب اور جلودار اور چوبدار ۔۔۔ یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
اسی اپنے معمول و دستور سے ۔۔۔ ادب سے تفاوت سے اور دور سے
بڑھا نوجوانو بڑھے جائیو ۔۔۔ دو جانب سے باگیں لئے آئیو

[1] وہ نشان جو بادشاہوں کی سواری کے آگے رہتا تھا۔ اصل میں سات شکلیں تھیں۔ آفتاب۔ نشان پنجہ۔ ترازو۔ اژدہا۔ سورج مکھی۔ مچھلی۔ زمین کا گولا۔ [2] گروہ [3] گھوڑے جو سواری کے آگے محض زینت کی غرض سے رکھتے تھے۔ [4] حضرت جبرئیل [5] ایک قسم کی عماری جو ہاتھی پر رکھتے تھے۔

بڑھے جائیں آگے سے چلتے قدم — بڑھے عمر و دولت قدم با قدم
غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
تماشائیوں کا جدا تھا ہجوم — کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم
لگا قلعے سے شہر کی حد تلک — دکانوں پہ تھی بادلے کی جھلک
منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در — تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر
کیا تھا زبس شہر آئینہ بند — ہوا چوک کا لطف اِک چار چند
رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ — گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ
ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن — ہر اک سطح تھا جوں زمینِ چمن!
لگا نیچ[1] سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف
وحوش و طیوروں[2] تلک لے محل — پھٹے آشیانوں سے اپنے نکل
نہ پہنچا جو اک مرغ قبلہ نما — سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

میر حسن

بکاؤلی کے باغ سے پھول کا غائب ہونا

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خوابِ آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام[3]
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

---

[1] کمینے۔ [2] وحشی جانور اور پرندے۔ [3] پھول جیسی نازک۔

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا[۱] ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا[۲] ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل[۳]

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار[۴] دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس[۵] تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ[۶] ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پڑی اوس[۷]

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی[۸] وہی چشم حوض کا تھا

نام اسکا صبا نہ لیتی تھی میں — اُس گل کو ہوا[۹] نہ دیتی تھی میں ✗

گلچیں کا جو جائے ہاتھ ٹوٹا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

Vaeah

۱ غائب ہو گیا۔ ۲ نیا واقعہ پیش تھا ۳ دھوکا۔ ۴ غم میں ڈالنا۔ ۵ نرگس۔ سوسن۔ سنبل سوسن وغیرہ سب خواصوں کے نام ہیں۔ ۶ جل جائے ۷ برباد ہو گیا ۸ زینت ۹ احتیاط سے رکھنا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل | مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا ہوا نہ بتلا | خوشبو ہی سنگھا پتہ نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے | گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام | تھی سبزے سے راست مو براندام

انگلی لبِ جو پہ رکھ کے شمشاد | تھا دم بخود اُسکی سن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اُسکا غرض لگا بدلنے | گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

ہاتھوں کو ملا کے ہائے ہیہات | خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

جس نے مجھے ہاتھ سے لگایا | وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

یہ کہہ کے جنون میں غضبناک | خوں رُوئی لباس کو کیا چاک

گل کا سا لہو بھرا گریبان | سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو | اب چین کہاں بکاولی کو

تھی لب کہ غبار سے بھری وہ | آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی | گلچیں کا کہیں پتہ لگاتی

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثلِ باد جاتی | اُس رنگ کے گل کی بُو نہ پاتی

بے محنت کسی کو کچھ ملا ہے | پتہ کہیں حکم بن ہلا ہے؟

---

[1] غصہ کے مارے بدن کے رُونگٹے کھڑے ہونا [2] گلاب کی پتی [3] افسوس [4] انگوٹھی [5] رنجیدہ تھی [6] جلدی سے اٹھی۔

مرغِ اسیر کی صیاد کو نصیحت

اک مرغ[1] ہوا اسیرِ صیاد — دانا تھا وہ طائرِ چمن زاد
بولا جب اُس نے باندھے بازو — کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں — گر ذبح کیا تو مُشت پر ہوں
پالا تو مفارقت ہے انجام — دانا ہو تو مجھ سے لے کے مر دام
بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ — سمجھاؤں جو پند[2] اُسے گرہ باندھ
سُن کوئی ہزار کچھ سنائے — کیجے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو کیجیے نہ غفلت — عاجز ہو تو ہارئیے نہ ہمت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے — جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجیے
طائر کے یہ سُن کلام صیاد — بن داموں ہوا غلام صیاد
بازو کے جو بند کھول ڈالے — طائر نے تڑپ کے پر نکالے
اک شاخ پہ جا چہک کے بولا — کیوں؟ پر مرا کیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری مجھے اُڑایا — غفلت نے تری مجھے چھڑایا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے — تھا لعل نہاں شکم میں میرے
دے کر صیاد نے دلاسا — چاہا پھر کچھ لگائے لاسا
بولا وہ کہ دیکھ کر کیا جل — طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل
اربابِ غرض کی بات سُن کر — کر لیجے یک بیک نہ باور

[1] پرندہ [2] نصیحت یاد رکھو کہ مر گیا۔

گھر کی ہجو

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

ظلمتیں اس کی سب روشن ہیں
زندہ در گور ہم کئی تن ہیں!

ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار
واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار

بخت بد دیکھو سارے پرنالے
اس کے معمار نے ادھر ڈالے

اب جو آیا ہے موسم برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ[1] بالا ہے
کوچہ موج ہے کہ نالا ہے

مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک[2] تنکے تھے کچھ ایک نئے
سوئے چڑیوں کے گھونسلے میں گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احسان مند
کہ جنہوں نے کئے ہیں جھانکے بند

بیلن کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے
بالس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

اڑ گئی گھاس پھوس تھی سب واہ
ہے جو بند صحن سو کڑی کا جالا

اپنے بند صحن سے جو کھوٹا ہے
ہم پہ گویا وہ بالس ٹوٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکو کو کیجیے تا کے
یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے

ٹیکی دینے[3] کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ چھپر لئے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

---

۱ صحن میں پانی ایک نیزہ بلند ہے ۲ پچھلے سال تک ۳ سہارا دینے کو۔

آ گئے سب گھڑے میں پانی ہیں ۔ خاک ہے ایسی زندگانی میں
اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے ۔ سر پہ گٹھری ہے تس پہ چھپر ہے
پانی بہ کر جھکا جو ہے دالان ۔ سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوانؔ
چاک ابن دولؔ سے ہے بہ رنگ ہوا ۔ جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگا
متصل نیکلے ہے نہ باراں ہے ۔ گریۂ زار سب گواراں ہے
گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے ۔ چھت بھی بے اختیار روتی ہے
مینہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا ۔ کوئی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
داسے پایان کار ٹوٹ بہے ۔ طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ بہے
بہ گئے گولے تختے ڈوب گئے ۔ غرض اجزائے سقفؔ خوب گئے
موج خشتی ستون میں بیٹھی ! ۔ جانِ غمناک خون میں بیٹھی !
لے گیا پیچ و تاب پانی کا ۔ کوٹھری تھی حباب پانی کا
یوں ڈہا گھر کہ بار خاطر تھا ۔ آہ کس کا غبار خاطر تھا
اُکھڑی دہلیز سب سنڈیر گری ۔ لہری پانی کی جھاڑو دیتی پھری
ساری بنیاد پانی نے کاٹی ۔ اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹیؔ
جھک گئے سب ستون در بیٹھا ۔ وہی چھپر کھڑا ہے گھر بیٹھا
جب اجارے پیا کے چھت ٹھہری ۔ ہم سبھوں کی یہ مصلحت ٹھہری
آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں ۔ کسوٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

۱؎ اس بیت سے مکان گرنے والا ہے کی طرح سے برابر سے چھت سے مٹی۔

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب | ہے یہاں سے کنارا کرنا خوب

سن کے ہر ایک کے جی میں ڈر آیا | خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی ہیں اٹھائی تھی | سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا | اُسکا سارا فگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا | کوئی سر پر اُجاغ[1] لے نکلا

چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا | مینہ کے مارے کوئی لوٹ چلا

منہ پہ چھلنی کو ایک لے رویا | ایک نے سِرکی کا کیا گھونپا

ایک نے چھینکے حال حال لئے | پائے پٹّی گلے میں ڈال لئے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا | اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر | الگنی سر کے ہاتھ میں جے کر

صف کی صف نکلی اِس خرابی سے | تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے

تیز جی اِس طرح سے آتے ہیں | جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جن نے اُسوقت آنکھ کو کھولا | ہنس کے بے اختیار وہ بولا

سن کے اِس بات کو تر[2] آئے ہم | یارے اِک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو تابلک ہیں خجل اب | نہیں ملتا ہے گھر بقدرِ حباب

جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش[3] کریں

---

۱ چولہا ۲ فارسی محاورہ تر آمدن کا ترجمہ ہے۔ یعنی شرمندہ ہونا ۳ رہنا سہنا۔

مُسدّسات

مسدس کے معنی عربی میں چھ کے ہیں اور اصطلاحی طور پر اُس نظم کو کہتے ہیں کہ جس میں چھ چھ مصرعوں کا ایک ایک بند ہوتا ہے۔ پہلے چاروں مصرعوں کا ایک قافیہ ہوتا ہے۔ اور آخیر کے دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ دونوں مصرعے ٹیپ کا شعر کہلاتے ہیں اور شعرا اپنا زور کلام زیادہ تر اسی شعر میں دکھاتے ہیں۔

مسدسات کی ذیل میں مرثیے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اور خصوصاً انیس و دبیر کے مرثیوں نے اردو شاعری میں ایک ایسا معیار قایم کر دیا ہے کہ جس پر زبان اور ادب صدیوں ناز کرینگے۔

سوالات

۱۔ مسدس کے اصطلاحی معنی بتاؤ؟

۲۔ مسدس اور مثنوی میں کیا فرق ہے؟

حضرت امام حسینؑ کی مدینہ سے روانگی

یہ کہتی تھیں زینبؑ[1] کہ پکارے شہِ عادل | تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل | رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے کا حاصل

چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقتِ سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو انکو کہ جو ہیں ملنے کو آئے | کہدو کوئی گہوارۂ اصغرؑ[2] کو بھی لائے
نادان سکینہؑ[3] کہیں آنسو نہ بہائے | جانے کی خبر میری نہ صغراؑ[4] کہیں پائے

ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اسکا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار سنبھل جائے

سن کر یہ سخن بانوؑ[5] نے ناشاد پکاری | میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہوگئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری | یہ کس کیلئے کرتے ہیں سب گریہ و زاری

اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا | صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھ سے ملتا

---

[1] امام حسینؑ کی بہن [2] امام حسینؑ کا چھوٹا سا بچہ جس کی عمر چھ مہینے کی تھی [3] امام حسینؑ کی چھوٹی لڑکی۔
[4] امام حسینؑ کی بڑی لڑکی جو بیماری کی وجہ سے سفر میں ساتھ نہیں جاسکیں [5] امام حسینؑ کی بیوی۔

میں تو اسے بے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا — رہجاتیں جو نہیں بھی تو دل اسکا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کے پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھیں تو کھولو — کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو — چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہوشیار ہو کیا صبح سے بیہوش ہو خواہر — اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اٹھ کے کھڑی روتی ہے مادر — ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اٹھا کر
افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی؟

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے — بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے — کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے
جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
واللہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سیدِ خوشخو — اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوشبو — آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

۱؎ امام حسینؑ کی دوسری لڑکی جو سفر میں ساتھ تھیں ۲؎ امام حسینؑ کے صاحبزادے ۳؎ زہرا امام حسینؑ کی والدہ اور حضرت محمدؐ صاحب کی بیٹی کا نام۔ گلِ زہرا سے مراد امام حسین ہیں۔

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آ گئے ہیں امّاں
کیا میرے بیمار کے پاس آ گئے ہیں امّاں

ماں نے کہا ہاں ہاں یہی آئے ہیں مری جان | جو کہنا ہو کہہ لو کہ یہاں اور ہیں ماں
دیکھو تو ادھر روتے ہیں بابا بی شہ ذیشاں | صغرا نے کہا ان کی محبت کے میں قربان

وہ کونسا ساماں ہے جو یوں رکھتے ہیں بابا
کھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

پھر گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر | نہ فرش نہ ہے مسندِ فرزند پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر | اجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

کچھ منہ سے تو بولو کہ مرا دم گھٹتا ہے امّاں
کیا سبطِ پیمبر[1] سے وطن چھٹتا ہے امّاں

شبیر[2] کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم | صغرا کے لئے رونے لگیں زینب و کلثوم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیدِ مظلوم | پردہ رہا اب کیا تمہیں خود ہو گیا معلوم

تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار | بس پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں ہو جو بیمار | تکلیف تمہیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار[3]

غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا [illegible] ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

---

[1] حضرت امام حسین ۔ [2] امام حسین کا دوسرا نام [3] بالکل۔

لوں چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام | جنگل ہیں نہ راحت ہے کہیں راہ میں آرام
بستی ہیں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام | دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار | پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار | تبرید[1] فقط آپ کا ہے شربت دیدار

گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئیگا پسینہ تپ اُتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں | اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہونگی سفر میں | قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئیگی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر | ہر صبح میں پی لونگی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہینگے علی اصغر | لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ[2] کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ | میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائیگا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ | ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ

---

[1] ٹھنڈائی۔ [2] ایک لونڈی کا نام۔

ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نورِ نظر آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا | تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا | یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینہ میں سنبھلتا
جز صبر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

مُنہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم | چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ بھی ہم
ماں کہتی تھی تم کیا ہو بی بی بشہ عالم | میرے تو کلیجہ پہ چھری چلتی ہے ہر دم
وہ درد ہے جس درد سے چارہ نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار | سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار | اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مُردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر | اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر | وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر[1]
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

---

[1] قسمت

کیا اُن کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے | ہیں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے | زلفیں جو الجھتیں تو سلجھوانے کو آتے
کل تک تو مرے حال پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھ کو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباس[1] دلاور | ہیں کون جو آج میری خبر پوچھتے آکر
سرسبز رہے خلق میں نوباوۂ شبّر[2] | شادی ہیں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولہا نے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و رنجور | بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی ہوں میں مجبور | ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر | چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
تو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر | منہ دیکھ کے چپ ہو گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ | اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ | رخصت ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ

۱ امام حسین کے چھوٹے بھائی ۲ امام حسن کے نوجوان بیٹے امام حسین کے بھتیجے قاسم

چلتے ہوئے جی بھر کے اسے پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر | کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر؟
چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر | محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر

صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی
جل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے | تلوار لئے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس ہے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے | کیوں روتے ہو اشک آنکھوں کے ڈھلنے کے میں صدقے

جلد آن کے بھینا[1] کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبر | چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبر | ڈھونڈینگی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبر

دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

کیا گذرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی | کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی | کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی

کیا دم کا بھروسہ کہ چراغ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو کل ہم سفری ہیں

---

[1] [illegible] چاند چھپے۔

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا | صحبت کے جو ہیں اُن میں کہاں میرا ٹھکانا
بھیا جو اب آنا تو مری قبر پر آنا | ہم گور کی منزل کی طرف ہونگے روانا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمہاری ہے تو یہ راہ ہماری

ہاں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان | گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان | صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبے کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری | اصغر مرا روتا ہے صدا سُن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری | آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی | تپ ہے تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب تک وہ سخن لا نہیں سکتی | رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار | صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اکبار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار | جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری ج

لہ محبت۔

دنیا سے کوئی دن میں گذر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

انیس

حضرت علی اکبر کی شہادت

جس دم سنی حسین نے یہ جانگزا صدا | صابر اگرچہ تھے یہ کلیجہ الٹ گیا
ہاتھوں سے دل کو تھام کے دوڑے بہت پا | نعرہ کیا کہ اے علی اکبر کدھر گیا

دل گیر غریب و بیکس و تنہا سے جائیو
آ لے ضعیف باپ تو دنیا سے جائیو

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پسر | خوشرو پسر سعید پسر قدرداں پسر
مادر کا چین، باپ کا آرام جاں پسر | کم گو پسر، شہید پسر، نوجواں پسر

مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نور عین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

مجھ کو غریب دشت بلا کہہ کے پھر پکار | اک بار یا شہ دو سرا کہہ کے پھر پکار
اے شیر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار | صدقے ہو باپ یا ابتا کہہ کے پھر پکار

میری بھی جان تن سے ترے ساتھ جائے گی
مرجاؤں گا نہیں جو نہ آواز آئے گی

کچھ ہوش و حسرت پا کا نہیں بحواس ہوں | زخمی ہے قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں

۱؎ دردناک ۲؎ دونوں دنیا کے بادشاہ۔ ۳؎ شہیدوں کے سردار۔ ۴؎ باپ۔

غمگین ہوں مُردہ دل ہوں حزین ہوں اُداس ہوں — دم توڑ دو تم تو ہے غضب اے حسین پاس ہیں
کیونکر قرار آئے دلِ ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے آنکھوں کے نور کو

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطانِ بحر و بر — بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
اٹھا یہ دل میں درد کہ خم ہو گئی کمر — دیکھا جو زخم مُنہ کے قریب آگیا جگر
تڑپے جو گر کے اور تڑپ کر ٹھہر گئے
غل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیر مر گئے

ہوش آیا تین ساعتِ[1] کامل کے بعد جب — دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہِ[2] رسول اب
آنسو بہا کے رکھ دیئے بیٹے کے لب پہ لب — چلاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہے غضب
دل سے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبر نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ پدر — گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے اِدھر اُدھر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سرِ پسر — روتے ہو کس کے واسطے اے غیرتِ قمر
یاں سے اٹھا کے آلِ پیمبر میں لے چلیں
غم ماں کا ہے تو آؤ تمھیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں اے شہِ اُمم[3] — اب کھینچیے قبلہ[4] رُو کہ نکلتا ہے تن سے دم
دولت ملی کہ دیکھ لئے آپ کے قدم — غیر از غمِ فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم

---

[1] پورے تین گھنٹے بعد [2] حضرت علی اکبر جن کی شکل حضرت محمد صاحب سے بہت ملتی تھی۔
[3] امت کے بادشاہ یعنی امام حسینؑ [4] مغرب کی طرف مسلمان مرتے وقت مُنہ کر دیتے ہیں۔

ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
روتا ہوں اس لئے کہ اکیلے حضور ہیں!

سن لے کہا مرے لئے بیٹا نہ رو و بس | ہوگا جہاں کے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس | میرے لئے ہے اب دمِ خنجر ہر اک نفس
اکبر ترے الم سے جگر چاک چاک ہے
جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پہ خاک ہے

یہ بات سن کے لینے لگا ہچکیاں پسر | سوکھی زبان کھائی کہ پیاسا ہوں اے پدر
زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سر بسر | دو بار لی کراہ کے کروٹ ادھر ادھر
دنیا سے انتقال ہوا نورِ عین کا
ہنگامہ طرفہ تھا کہ لٹا گھر حسین کا

نکلی ادھر تو جسم سے اکبر کی جانِ زار | یاں بیبیاں ہوئیں درِ خیمہ پہ بیقرار
فضہ پکاری ڈیوڑھی سے بڑھ کر یہ ایک بار | اکبر پہ کیا گذر گئی اے شاہِ نامدار
چھریاں غم و الم کی کلیجے پہ چلتی ہیں
جلد آیئے کہ حضرت زینب نکلتی ہیں

گھبرا کے شاہِ دیں نے اٹھائی پسر کی لاش | لپٹائے تھے کلیجے سے لختِ جگر کی لاش
لائے قریبِ خیمہ جو اُس سیمبر[1] کی لاش | غل پڑ گیا کہ آتی ہے رشکِ قمر کی لاش
زہرا کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام[2] سے باہر نکل پڑیں

[1] چاندی جیسے بدن والے۔ [2] خیمہ کی جمع۔

سر ننگے شہ کے گرد تھیں شہزادیاں تمام | تھے بیچ میں شہید کا لاشہ لیے امام
بانو پکارتی تھی کہ یا شاہِ تشنہ کام | جیتا ہے یا جہاں سے گیا میرا لالہ فام

منکا ڈھلا ہے ہونٹوں پہ سوکھی زبان ہے
اے جانِ فاطمہ مرے بچے میں جان ہے؟

زینب تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار | یہ لاش میری گود میں دیجیے بہن نثار
طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہِ نامدار | صدقے گئی لرزتا ہے فاقوں سے جسمِ زار

شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن نہ اٹھے گا لاشہ جوان کا

لاشہ پسر کا خیمہ میں لائے امامِ پاک | مسند رسولِ حق کی بچھائی بروئے خاک
شہ نے لٹا کے لاش جو کی آہِ دردناک | دل بیبیوں کے ہو گئے سینے میں چاک چاک

پہلے گماں تھا غش ہے وغا کر کے آئے ہیں
آخر یقین سب کو ہوا مر کے آئے ہیں

لاشے کے پاس ہائے پسر کہہ کے ماں گری | ہاتھوں سے دل پکڑ کے پھپھی نیم جاں گری
دل پر ہر اک کے برقِ غمِ نوجواں گری | غش ہو کے یاں گری کوئی لہد کوئی واں گری

چھوٹی بہن جو لاشے سے آ کر لپٹ گئی
اک حشر ہو گیا صفِ ماتم الٹ گئی

انیس

سلہ لڑائی۔

پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی | کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تا کر لو اس سے اپنی پرائی | نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی

طلب سے ہے دنیا کی گر یاں نیت؟
نہ چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت

امیروں کو تنبیہ کی اس طرح پر | کہ ہیں تم میں جو اغنیا اور تونگر
اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر | بنی نوع کے ہوں مددگار و یاور

نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک گام ہرگز

تو مردوں سے آسودہ تر ہے وہ طبقہ | زمانہ مبارک ملے جس کو ایسا
پہ جب اہلِ دولت ہوں اشرارِ دنیا | نہ ہو عیش میں جن کو اوروں کی پروا

نہیں اس زمانے میں کچھ خیر و برکت
اقامت سے بہتر ہے اس وقت رحلت

دیے پھیر دل ان کے مکر و ریا سے | بھرا ان کے سینوں کو صدق و صفا سے
بچایا انھیں کذب سے افترا سے | کیا سرخرو خلق سے اور خدا سے

رہا قولِ حق میں نہ کچھ باک ان کو
بس اک شوب میں کر دیا پاک ان کو

۱ دوسری دنیا۔ ۲ آخرت ۳ غنی کی جمع ۴ شریر کی جمع ۵ ٹھہرنا۔ ۶ روانہ ہو جانا ۷ سچائی۔
۸ جھوٹ ۹ بہتان ۱۰ ڈر ۱۱ کپڑے کا ایک بار دھونا۔

کہیں حفظِ صحت کے آئیں سکھائے | سفر کے کہیں شوق اُن کو دلائے
مفاد اُن کو سوداگری کے سجھائے | اُصول اُن کو فرماں دہی کے بتائے
نشاں راہِ منزل کا اک اک دکھایا
بنی نوع کا اُن کو رہبر بنایا

ہوئی ایسی عادت پہ تعلیم غالب | کہ باطل[1] کے شیدا ہوئے حق کے طالب
مناقب[2] سے بدلے گئے سب مثالب[3] | ہوئے روح سے بہرہ ور اُن کے قالب
جسے راج رد کر چکے تھے وہ پتھر
ہوا جا کے آخر کو قایم سرے پر

جب اُمّت کو سب مل چکی حق کی نعمت | ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجّت | نبیؐ نے کیا خلق سے قصدِ رحلت
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

سب اسلام کے حکم بردار بندے | سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے | یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے
رہِ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے | کہانت[4] کی بنیاد ڈھا دینے والے
سرِ احکامِ دیں پر جھکا دینے والے | خدا کے لئے گھر لٹا دینے والے

[1] جھوٹ [2] خوبیاں [3] برائیاں [4] جانوروں کی آواز سے شگون لینا یہ رسم عرب میں بہت عام تھی

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے (حالیؔ)
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف اُن میں باہم دگر تھا | تو بالکل مدار اُس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا | خلاف آشتی[1] و خوش آئندہ تر تھا

یہ تھی موج پہلی اس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغ گیتی

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت | نہ پوشش[2] سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت | فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں | ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذمی[3] و مسلم کو یکساں | نہ تھا عبد[4] و حر[5] میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

رہ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی | فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ[6] اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ اُن کی | شریعت[7] کے قبضہ میں تھی باگ اُن کی

---

[1] صلح [2] لباس [3] غیر مسلم لوگ جو مسلمانوں کی امان میں رہیں۔ [4] غلام
[5] آزاد [6] لڑائی [7] اسلامی قانون۔

جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کفایت جہاں چاہیئے واں کفایت | سخاوت جہاں چاہیئے واں سخاوت
جچی اور تلی دشمنی اور محبت | نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت

جھکا حق سے جو جھک گئے اس سے وہ بھی
رکا حق سے جو رک گئے اس سے وہ بھی

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا | اک اندھیر تھا ربع[۱] مسکوں میں چھایا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایا | بلندی سے تھا جس نے سب کو گرایا

وہ قومیں جو ہیں آج گردوں کے تارے
دھندلکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا | نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا | پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا

جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا

ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا | کہ تھا گیان گن کالدیاں سے ڈیرا
ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا | کہ دل سب کے کیش و کنش سے تھا پھیرا

نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں میں
نہ یزداں[۲] پرستی تھی یزدانیوں میں

---

[۱] کرۂ زمین میں جو تھائی خشکی اور تین چوتھائی پانی ہے۔ ایک چوتھائی آبادی کو ربع مسکون کہتے ہیں
[۲] پارسی مذہب میں اچھائی کے خدا کو یزداں کہتے ہیں اور برائی کے خدا کو اہرمن۔

ہوا ہر طرف موجزن تھی بلا کی | گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت[۱] کی حد تھی نہ پرسش خطا کی | پڑی لٹ رہی تھی ودیعت[۲] خدا کی
زمیں پر تھا ابرِ ستم کا دونگڑا[۳]
تباہی میں تھا نوعِ انساں کا بیڑا

وہ قومیں جو ہیں آج غمخوار انساں | درندوں کی اور اُن کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں | بہت دُور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں
بنے آج جو گلّہ باں ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیئے آدمی خوار سارے

ہنر کا جہاں گرم بازار ہے اب | جہاں عقل و دانش کا بیوپار[۴] ہے اب
جہاں ابرِ رحمت گہر بار ہے اب | جہاں ہُن برستا[۵] لگاتار ہے اب
تمدن کا پیدا نہ تھا واں نشاں تک
سمندر کی آتی نہ تھی موج واں تک

نہ رستہ ترقی کا کوئی کھلا تھا | نہ زینہ بلندی پہ کوئی لگا تھا
وہ صحرا انھیں قطع کرنا پڑا تھا | جہاں نقشِ پا تھا نہ شورِ درا تھا
جونہی کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود اُن کا دل رہنمائی

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا[۶] کے اٹھی | پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی | جو ٹیگس[۷] پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

---

۱ سزا۔ ۲ امانت۔ ۳ سخت بارش۔ ۴ لین دین۔ ۵ دولت کی کثرت۔ ۶ مکہ۔ ۷ اسپین کی ایک بہت بڑی ندی۔

رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

کیا اُمیوں[۱] نے جہاں میں اُجالا | ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بُتوں کو عرب اور عجم سے نکالا | ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانے میں پھیلائی توحیدِ مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آوازِ حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں | پڑی کھلبلی کفر کی سرحدوں میں
ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں | لگی آگ سی اُڑنے سب معبدوں میں
ہوا کعبہ آباد سب گھر اُجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ کر

لئے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے | کیا کسبِ اخلاق روحانیوں[۲] نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں[۳] نے | کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مُردہ فنوں کو جِلایا | فلاطوں کو پھر زندہ کر کے دکھایا
ہر اک شہر و قریہ[۴] کو یوناں بنایا | مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

[۱] ان پڑھ۔ چونکہ عرب اسلام سے پہلے جاہل تھے اس لئے یہاں مراد عربوں سے ہے [۲] وہ لوگ جو روحانی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مثلاً عیسائی۔ [۳] اصفہان والے [۴] گاؤں

ہر اِک میکدے سے بھرا جا کے ساغر — ہر اِک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر — گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر

کہ حکمت کو اِک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

ہر اِک علم کے فن کے جویا[۱] ہوئے وہ — ہر اِک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت[۲] میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ — سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اِک ملک میں پھیلی اُن کی امارت[۳]
ہر اِک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں — مہیّا کئے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — اُنھیں کر دیا رشکِ صحنِ گلستاں

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پَود اُنہی کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفّا[۴] — دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جابجا میل و فرسخ کے برپا — سرِ راہ کنوئیں اور سرائیں مہیّا

اُنھیں کے ہیں سب نے یہ چربے اُتارے
اُسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

حالی

---

۱ ڈھونڈنے والے ۲ بیج بونا اور درخت لگانا ۳ امیری ۴ صاف۔

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے | دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں[1] سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے | اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں[2] ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا[3] کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری | چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری | چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش[4] اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو | سرمد[5] نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو | سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سورمے[6] ہیں اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اُنکا اثر عیاں ہے | اپنی رگوں میں اب تک انکا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے | فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

[1] پیشانی [2] عزت اور شہرت [3] بلندی [4] روشن، علم و فضل کا سورج [5] ایک مشہور صوفی شاعر [6] جنگ اور بہادری سے

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

۱؎ جانور کے سینگ کا جوڑ ۔ ۲؎ چنبیلی کا پھول ۳؎ دودھ کی ندی

گردِ غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو
چکبست

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بےگناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھونے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ[1] رنج و محن کھلا

---

[1] بدن کا رونگٹا سختی مصیبت۔

تیزی۔ سختی۔

اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیا لہو سپید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد[1] ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں[2] سے گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

[1] ہمیشہ کی زندگی۔ [2] محنتوں۔

چھٹتی ہوں اُن سے جو کہ کیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر

رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعائیں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجھدار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ

آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں کو عفو ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُنکر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور

صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

۱ فقیر ہونا۔ ۲ یعنی اگر اولاد نہ ہوتی۔ ۳ نصیبہ۔ ۴ موت۔ ۵ معاف۔ ۶ رونے سے مدد کا ۷ رنجیدہ ۸ زیادتی ۹ دشوار

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ چھل[۱] یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر	ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر	کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر

خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار[۲]	واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار	ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب	جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں[۳] سے قلب و جگر ہو گئے کباب	پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب[۴]

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی	قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی	ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو ملا کے خاک کیا اپنے ہات سے

---

۱ دھوکہ۔ ۲ پھیلاؤ۔ ۳ دل کا غم ۴ جوانی۔

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اسکو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا[1] میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام
قائم اُمید ہی سے ہے دنیا ہے جسکا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر[2] نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض[3] کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم اُنھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار
موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے[4] روزگار
وہ ابر و باد و برق میں رہتے ہیں برقرار

[1] خدا کی مرضی۔ [2] چھٹکارا۔ [3] محنت۔ [4] خدا۔

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر | صحرا چمن ہے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر | رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بیخبر

اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
داماںِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر | سنکر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر | جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر

پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مُردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سُنی سب یہ داستان | لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان | بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں

اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر ہے یہ مرا وقتِ واپسیں | کیا اعتبار آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئیگا اس دل کو ہے یقیں | سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں

۱ مہربان ہو ۲ مگر ۳ عمر گھٹ ۴ نصیحت ۵ مرنے کا وقت ۶ غمگین

اولاد جب کبھی تمھیں صورت دکھائے گی
فریادِ اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں | باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں | جاؤ سدا رہو خوش رہیں رو کی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہونگی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہونگی میں

نشتر تھے راؔم کے لئے یہ حرفِ آرزو | دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو | سُنّی پڑے اسے یہ خجالت کی گفتگو

کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند | رُک رُک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہنچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند | مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند

جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لئے
دوزخ یہ زندگی ہے اُس اولاد کیلئے

ہے دُور اس غلام سے خود رائی کا خیال | ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال | جو دین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال

جانا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدہ نے باپ کے

---

۱ شرم ۲ تکلیف ۳ ضد۔ ہٹ دھرمی۔ ۴ قرض

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ
لیکن بہارِ عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ
ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل میں لگے گا داغ

بے آبرو یہ بنس[2] نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اسکا پاس[3] ہے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہونگا میں
کس طرح منہ دکھانے کے قابل ہونگا میں
کیونکر زبانِ غیر کے طعنے سنونگا میں
دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کرونگا میں

لڑکے نے بیحیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا"

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب
خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سنکے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکیِ عتاب
چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں

ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرتھ کے تاج میں

چکبست

---

۱ دنیا ۲ خاندان ۳ لحاظ بشرم۔

رباعیات

رباعی ہمیشہ چار مصرعوں کی ہوتی ہے جس کا پہلا۔ دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے۔ اگر تیسرا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اساتذہ کے نزدیک یہ اور بھی بہتر ہے۔

رباعی میں عموماً اخلاقی اور اصلاحی مضمون نظم کئے جاتے ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے رباعی کے پہلے دو مصرعے ذرا ہلکے ہوتے ہیں۔ اور آخری دو مصرعے بہت بلند اور زوردار رکھتے ہیں۔ کیونکہ سننے والے پر مضمون کی چستی اور نصیحت کا اثر انہی آخری مصرعوں سے پڑتا ہے۔

سوالات

۱۔ رباعی کسے کہتے ہیں؟

۲۔ رباعی اور قطعہ میں کیا فرق ہے؟
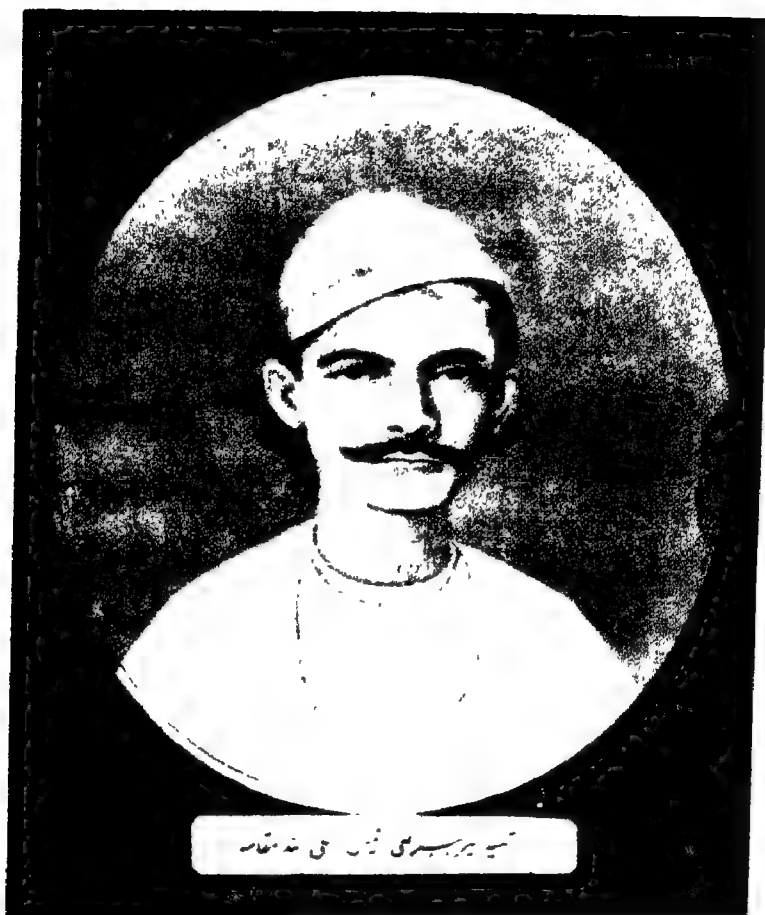
رُباعیات

بجلی کی طرح نظر سے مستور[1] ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہے اُس پر یہ بُعد[2]
اللہ اللہ کسقدر دُور ہے تو

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
لے زادِ سفر[3] کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانا ہوں
دیکھا نہیں جس کو اُسکا عاشق ہوں انیس
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

انیس

---

[1] پوشیدہ [2] دُوری [3] سفر کا سامان۔

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

پروانے کو دُھن شمع کو لَو تیری ہے
مصباح[1] و نجوم و آفتاب و مہتاب
عالم میں ہر ایک کو تگ و دو تیری ہے
جس نور کو دیکھتا ہوں ضَو[2] تیری ہے

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

دبیر

کانٹا ہے ہر اِک جگر میں اٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
حلقہ ہے ہر اِک گوش میں لٹکا تیرا
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
آتش پہ مغاں[3] نے راگ گایا تیرا
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

---

[1] چراغ۔ [2] روشنی۔ [3] پارسی مذہب کا پیشوا زرتشت۔

زاہد کہتا تھا جان ہے دیں پہ قربان
پر آیا جب امتحان کی زد پہ ایمان
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح
فرمایا کہ بھائی جان بھی ہے تو جہان

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند
اک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اِسکے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

پوچھا جو کل انجام ترقیِ بشر
یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب
ہو جائینگے جہل جہلا کے عیب ہنر

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتو
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں

آج اس کی ہے نوبت تو کل اسکی باری — بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

خالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن انھیں بھیڑیوں سے لازم ہے حذر — بھیڑوں کے لباس میں جو ہیں جلوہ نما

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح[1] — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دست یاب ہو میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

اک مرد توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اسکا ان کی گردن پہ وبال — دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے — پھر چاہیئے مانگنی مدد یزداں سے
جبتک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا — پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے — بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کیطرح — مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

---

[1] کھلنا سے سہ ما

ڈر ہے کہ پڑے ہاتھ نہ زر دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر چھونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک[۱]
ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

قانون ہیں جہاں بیشتر یقیناً بیکار
حاشا کہ ہو اُن پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت اُن کی
اور بد نہیں بنتے نیک اُن سے زنہار

حالی

کھولی ہے زبان خوش بیانی کیلئے
اُٹھا ہے قلم گہرفشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر
نظارۂ شاہدِ معانی کے لئے

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

رشوت ہے گلوئے نیکنامی کا چھرا
عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری
گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

---

[۱] وہ پتھر جس پر رگڑ کر سونا پرکھتے ہیں۔

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا
شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ غدر[۱] بھی ہے اک خصلتِ بد
واللہ کہ بے حیا سے مکّار اچھا

کہنے کو تو شاہ سب ہیں مہاراج ہیں سب
مالکِ دولت کے مالکِ تاج ہیں سب
لیکن کھولو جو چشمِ تحقیق اکبر
بے بس ہیں سب خدا کے محتاج ہیں سب

اب بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں
تسکین کے جو تھے سبب اُٹھے جاتے ہیں
اک قوتِ مذہبی عقیدوں سے تھی
وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

اکبر

---

[۱] فریب۔ دھوکا۔ طاقت۔

قصائد

کہتے ہیں کہ قصیدہ عربی لفظ قصد سے مشتق ہے جس کے معنی ارادے کے ہیں۔ چونکہ قصیدہ لکھتے وقت شاعر کا ارادہ ممدوح کی تعریف کا ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔

قصیدہ کا پہلا شعر غزل کی طرح مطلع کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہر شعر کا دوسرا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ ایک قصیدہ میں ایک سے زیادہ مطلع بھی ہو سکتا ہے۔

مشرقی شاعری میں غزل کے بعد نفاست اور نزاکت کے اعتبار سے قصیدہ کا نمبر ہے۔ کیونکہ شعراء قصیدوں میں نازک اور لطیف مضمون باندھ کر امراء اور بادشاہوں سے بڑے بڑے انعام حاصل کرتے تھے۔

قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطابیہ اور دوسرا تمہیدیہ۔

خطابیہ قصیدہ میں مطلع سے ہی مطلب شروع کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً شاعر بادشاہ کی تعریف کرنی چاہتا ہے تو مطلع ہی میں اپنا ارادہ ظاہر

کر دے گا۔ اس کے برعکس تمہیدیہ قصیدے میں پہلے تمہید کے طور پر کچھ شعر کہے جاتے ہیں۔ تمہیدیہ قصیدے کے تین حصّے ہوتے ہیں۔

ابتدائی حصہ جس میں عموماً تمہید کے طور پر شاعر کبھی بہار کا حال اور کبھی کسی اور قدرتی منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں قصیدے کے اس حصہ کو تشبیب کہتے ہیں۔

تمہید بیان کرتے کرتے شاعر اس خوبصورتی سے اپنے ممدوح کا ذکر لاتا ہے کہ سننے والے کو یہ اچانک ممدوح کا تذکرہ بے ربط معلوم نہیں دیتا اسے گریز کہتے ہیں۔

گریز کے بعد شاعر اپنے مطلب پر آتا ہے۔ یعنی ممدوح سے کچھ طلب کرتا ہے۔ اسے تخلیص کہتے ہیں۔ عام طور پر تخلیص کسی دعائیہ فقرہ پر ختم ہوتی ہے۔

سوالات

۱۔ قصیدہ کسے کہتے ہیں؟

۲۔ قصیدے کی قسمیں بتاؤ۔

۳۔ تمہیدیہ قصیدے کے کون کون سے اجزا ہیں۔ اور ان کا کیا مطلب ہے۔

۴۔ قصیدہ اور غزل میں کیا فرق ہے؟

ہاتھی کی تعریف

اس کی گجگاہ کی اللہ رے چہرے پہ لٹک
کہکشاں جوں شبِ یلدا[1] میں نمایاں بفلک

بیٹھنے میں ہے وہ کوہ اُٹھنے میں ہے ابر سیاہ
عرش رفعت[2] میں ہے چلنے میں ہے جوں چرخ اتھک[3]

شجرِ طور کا چہرے پہ ہو اس کے جلوا
رنگیں تزئیں[4] کے لیے جس گھڑی اُس کا مستک[5]

جھول پر اس کی ستاروں کا کہوں کیا میں حسن
تارے جس طرح رہیں رات اندھیری میں چمک

ق
لے کے خرطوم[6] میں زنجیر پھراوے وہ اگر
اس کے دانتوں کو یہ سمجھے جو کوئی ہو زیرک[7]

لیلے نے ہاتھ نکالے ہیں سیاہ خیمہ سے
ملنے کو مجنوں سے سن سلسلۂ پا[8] کی جھنک

روزِ میداں اسے دیکھو تو دلاور اپنا
سر کے واں سے نہ جہاں سے کہ زمیں جائے سرک

ق
جھنگ کیا چیز ہے لاوے وہ جسے خاطر میں
بان بجلی کی کڑک کا کبھی پہنچے اُس تک

---

[1] اندھیری رات [2] بلندی [3] نہ تھکنے والا [4] زینت [5] ماتھا [6] سونڈ [7] عقلمند [8] پاؤں کی زنجیر کی آواز۔

چاہے وہ توڑے کے جوں نیشکر اس کی جڑ کو
پاؤں کھجلانے لگے سونڈیں لے کر پو لٹک

بے تکاں اسقدر اس کا ہے چلاوا جیسے
مہر میں ابر کے سایہ سے ہو سایہ کی ڈھلک

اسقدر ہے وہ سبک رو کہ کبھی چلتے وقت
پاؤں کی اُس کے دلِ مور کو پہنچے نہ دھمک

سودا

ہاتھی کا سراپا

شان و شکوہ تیرے ہاتھی کی کیا کہوں میں
چرخی بجا ہے اس کی گر چرخ آسماں ہو

ہے سربلند اتنا یہ کچھ عجب نہیں ہے
انکس یہ ماہِ نو کے گردست پلیاں ہو

مستک پہ رنگ اس کی جس طرح جلوہ گر ہے
گو سانجھ لاکھ پھولے پر لطف یہ کہاں ہو

اس قد و قامت اپہ یہ حسن ہے کہ اس کی
زنجیر پا بجا ہے گر زلفِ مہوشاں ہو

ہاتھی میں یہ چلاوا کب ہے سوائے اسکے
تشبیہ پاب جس سے رفتارِ خوش عناں ہو

جو وقت تھان پر سے کھولا اسے مہاوت
ہمت سے تیری اس کو خطرہ یہ ہر زماں ہو

دیویں گے بخش مجھ کو ناحق کہیں صلے میں
یا رب حضور جاؤں تو واں نہ مدح خواں ہو

سودا

---

۱ انکس ۲ بہت سے کنگوں کا بندھا ہوا شگوفہ ۳ چیونٹی کا دل ۴ ... ۵ یعنی ہاتھی کو ممدوح کی سخاوت کا ڈر رہتا ہے۔ اس لئے دل میں دعا مانگتا ہے کہ جب میں بادشاہ کے حضور میں جاؤں تو خدا کرے وہاں کوئی مدح کرنے والا نہ ہو۔ ورنہ بادشاہ خوش ہو کر مجھے شاعر کو بخش دیں گے۔ یہ حسنِ طلب شاعر کا ہے۔

مریل ٹٹو

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار ۔۔۔ رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے ۔۔۔ ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے ۔۔۔ موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

تنہا وے نہ دہر سے عالم خراب ہے ۔۔۔ خسّت سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں ۔۔۔ پاوے مزاج اُن کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں تو روپے کے دیانت کی راہ سے ۔۔۔ گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب خوار

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس ۔۔۔ رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ناطاقتی کا اُسکے کہاں تک کروں بیاں ۔۔۔ فاقوں کا اب میں اُسکے کہاں تک کروں شمار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُس کا حال ۔۔۔ کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد ۔۔۔ امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یہ چمار

جبدن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ ۔۔۔ گذرے ہے اس [illegible] سے ہر شب ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر ۔۔۔ دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

دلّی تلک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ ۔۔۔ مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ ۔۔۔ ہو کر سوار اب کرو میدان کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین ۔۔۔ ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار

---

۱ دن رات کا گھوڑا ۲ ایک رفتار سے نہیں چلتا ۳ سائیس ۴ مٹی کا گھوڑا ۵ سوار ۶ طرح ۷ رات دن ۸ ستاروں۔

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں کیا کہوں ‏ — دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑا تھا منہ میں دُم ‏ — ٹک ٹک سے پاشنے[1] کے مرے پاؤں تھے لگا

آگے سے تو بڑا اُسے دِکھلاتا تھا سئیس ‏ — پیچھے نقیب بن کے تھا لاٹھی سے بار بار

کہتا تھا مجھ سے کوئی ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

سودا

حسنِ طلب

اے شہنشاہِ آسمان[2] اورنگ ‏ — اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں ‏ — تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ‏ — ہوئی میری وہ گرمیِ[3] بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز ‏ — روشناس ثوابت[4] و سیار[5]

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ‏ — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی ‏ — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار[6]

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ‏ — بادشہ کا غلام کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح ‏ — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر ‏ — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

---

[1] ایڑیاں [2] آسمان کے تخت پر بیٹھنے والے بادشاہ [3] شہرت [4] وہ ستارے جو حرکت نہیں کرتے [5] وہ ستارے جو حرکت کرتے ہیں۔ [6] شرم

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار[1]
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش[2] — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار[3]
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار[4]
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں چہارم کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیئے — ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے — ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

[1] سر پر ہونا [2] لباس [3] کمزور [4] طریقہ۔

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام	شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس !
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب

قصیدے کی تشبیب

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن رہا کہاں غائب	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص	حبذا[1] اے نشاطِ[2] عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے	لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا	صبح جو جاوے اور آوے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا	تیرا آغاز اور تیرا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے	مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام[3]
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں	ایک ہی ہے امید گاہِ انام[4]
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش	غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام[5]
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو	تب کہا ہے بطرزِ استفہام[6]

۱ بہت خوب ۲ خوشی ۳ چغل خور ۴ دنیا کے لوگ ۵ غلام ۶ سوال کے طور پر۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ / قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا / جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو / پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون / مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے / اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص / گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

غالب

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا / مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں / شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود / صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ / دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر / اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

ہمیشہ کی طرح ۱ رمضان کی عید ۲ پورا چاند ۳ مشرق۔ کبھی اس سے مراد سورج بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ مشرق سے نکلتا ہے ۴ یعنی دنیا کو روشن کرنے والا سورج نظر آیا ۵ یعنی رات کو جو ستاروں کا خزانہ آسمان پر نظر آتا تھا اسے ستاروں کے بادشاہ یعنی سورج نے اپنے قبضہ میں کر لیا اور وہ غائب ہو گئے ۶ سیمیا ایک قسم کا جادو ہے کہ جس سے وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ رات کو چاند اور ستارے جو نظر آ رہے تھے وہ سیمیا کی قسم کا جادو تھا۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں تھی ۷ کواکب جمع کوکب کی یعنی ستارے ۸ سرخ چہرہ والا معشوق۔ یعنی سورج۔

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر[1] ۔۔۔ بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی[2] کیلئے ۔۔۔ رکھدیا ہے ایک جامِ زر[3] کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ ۔۔۔ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا ۔۔۔ خسروِ آفاق[4] کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شاہ کہ ہے ۔۔۔ رازِ ہستی اُس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین[5] میں ۔۔۔ مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا[6]

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل[7] سے ۔۔۔ عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ۔۔۔ اُس کے سرہنگوں[8] کا جب دفتر کھلا

روشناسوں[9] کی جہاں فہرست ہے ۔۔۔ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر[10] کھلا

ق

توسنِ[11] شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ۔۔۔ تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب ۔۔۔ تو کہے بت خانۂ آذر[12] کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی ۔۔۔ منصبِ مہر و مہ و محور[13] کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ۔۔۔ میری حدِّ وسع[14] سے باہر کھلا

---

۱ جب جادو ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ ستارے کچھ نہیں تھے صرف نظر بندی تھی کہ جس طرح جادوگر نظر کے دھوکے سے کچھ دکھا دیتے ہیں ۲ وہ شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے ۳ سونے کا پیالہ یعنی سورج ۴ دنیا کے بادشاہ یعنی بہادر شاہ۔ ۵ پیدا کرنا ۶ یعنی بہادر شاہ کے پیدا ہونے سے معلوم ہوا کہ خدا نے نو آسمان اور سات ستارے انہی کے لئے بنائے تھے۔ ان سات ستاروں کے نام یہ ہیں۔ قمر۔ عطارد۔ زہرہ۔ خورشید۔ مریخ۔ مشتری۔ اور زحل۔ ۷ مناسب طریقہ پر بیان کرنا یعنی حضرت محمد صاحب نے جو حکم دیئے تھے بہادر شاہ ان کی اصلی وجہ بیان کر سکتے ہیں ۸ سپاہیوں ۹ جاننے والوں ۱۰ بادشاہ روم کا لقب ۱۱ گھوڑا ۱۲ ایک بہت بڑے بت تراش کا نام ۱۳ گھومنے والا چاند ۱۴ ہمت۔

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید[1] | کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا[2]

غالب

---

[1] میرا دل غم سے گھٹا جاتا تھا اور اس کے خوش کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ [2] یہاں کھلنے سے مراد بے تکلف ہو کر بات چیت کرنا ہے۔

غالبؔ اور ذوقؔ کے سہرے

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جوان بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں[1] سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے (بادشاہ) ان کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما[2] سے غالبؔ مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر زرنگار[3] کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جوان بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

---

[1] بادشاہ کے رشتہ دار مرشد زادے کہلاتے تھے [2] اشارے [3] سنہری

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اِس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا استاد مرحوم (ذوقؔ) بوجب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اِسے تو دیکھو۔ انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی "پیر و مرشد! درست"۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی۔ بہت خوب پھر فرمایا کہ ابھی لکھدو۔ اور مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی۔ حضور دیکھا۔ عرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن[1] و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

[1] شان و شوکت [2] خوش نصیبی۔

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید — رخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ — دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم — گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی — گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار — تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش — سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا — تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی دلہا — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدّھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنھیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا

۱ حضرت محمد صاحبؐ پر درود۔ مسلمان جب کوئی اچھی چیز دیکھتے ہیں تو صلِّ علیٰ یا سبحان اللہ کہتے ہیں۔
۲ اخلاص کے معنی محبت کے ہیں۔ اور قرآن شریف میں ایک سورت کا نام سورۂ اخلاص ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے پڑھنے سے محبت بڑھتی ہے۔ ۳ مبارک چہرہ ۴ نور کی جمع۔ ۵ منہ دکھائی۔ ۶ دیکھتے وقت ۷ خوبصورت منہ۔ ۸ عمدہ مضمونوں کے موتی۔ ۹ تعریف کرنے والا۔

کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گذرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

قطعہ

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا[1] سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک[2] ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر[3] کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما[4] ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند[5] اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون، اور ریختہ[6]، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر[7]
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع[8] میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

---

۱ بزرگوں کا پیشہ۔ ۲ طریقہ۔ ۳ بہادر شاہ کا تخلص ظفر تھا۔ ۴ ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک پیالہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس میں دیکھنے سے اُسے تمام دنیا کا حال معلوم ہوتا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ بادشاہ کا دل جمشید کے پیالہ کی طرح سب حال جانتا ہے۔ ۵ قسم۔ ۶ پہلے اُردو کو ریختہ کہتے تھے۔ مرزا غالب اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے تھے اس لئے کہتے ہیں کہ مجھے اردو شاعری سے کچھ تعلق نہیں صرف بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے یہ سہرا لکھ دیا۔ ۷ حکم ماننے کے لئے ۸ غالب کا اشارہ مقطع کی طرف ہے جس میں ذوق پر چوٹ کی تھی۔

قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری | ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالبؔ

مرثیہ مرزا غالب

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی | وقت کوتاہ قصّہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد | دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال | گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریبِ وہم و گماں | تاجِ فغفور[1] و تختِ خاقانی[2]
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب | جامِ جمشید و راحِ[3] ریحانی[4]
لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی | حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی[5] | اک تماشہ ہے حسنِ کنعانی[6]
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک | چشمۂ خضر[7] کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے | گر ملے خاتمِ[8] سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

۱؎ چین کے بادشاہوں کا لقب ۲؎ پہلے چین اور ترکستان کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ اب ہر بادشاہ کو کہتے ہیں۔ ۳؎ شادمانی ۴؎ شراب کی ایک قسم ۵؎ حضرت داؤد کی آواز بہت اچھی تھی ۶؎ حضرت یوسفؑ جنھیں چاہِ کنعاں میں ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا ۷؎ آبِ حیات ۸؎ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے زور سے دنیا پر حکومت کرتے تھے۔

جس سے دنیا نے آشنائی کی | اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر | تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ | ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اسکی | صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم | جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حظِ وضع سے مایوس | جسکو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے | شان ہو جس میں دلربائی کی
جنس کاسد سے ناروا تر ہے | خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس | آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد

اسد اللہ خان غالب مُرد

بلبلِ ہند مرگیا ہیہات | جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس | پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج | رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول | سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بہ مثل | دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا | قلم اس کا تھا اور اس کی بات

۱ لطف ۲ خراب حال ۳ ایران کے شاعر ۴ افسوس
۵ معتمد لوگ۔

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں | لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی | خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات (دولہا)
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم | یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں | کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل | کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب | کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد | کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں | اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو | سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح | اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی[۱] و صائب و اسیر و کلیم | لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے | ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت | نظم غنج[۲] و دلال[۳] کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر | تعزیت اک ملال کی صورت

۱ یہ سب فارسی کے مشہور شاعروں کے نام ہیں ۲ کرشمہ و ناز ۳ غمزہ و اشارۂ چشم۔

فال اسکا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ[1] سے پکڑ لیتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل[2] سے بدلتی تھی
رنگ ہجران وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری[3] و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئینگے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائینگے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

اتھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج (چبھن)

دلِ مضطر کو کون دے تسکین
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج (ہمدرد)

تلخیِ غم کہیں نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

---

[1] کلام کو پھیرنا یعنی مضر کو مفید اور جائز کو ناجائز کے معنی میں لینا۔ [2] کلام کو اس کے ظاہری معنی سے پھیر کر وہ معنی لینا کہ جن کا وہ احتمال رکھتا تھا۔ [3] ایران کے دو شاعر۔

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر | ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

نقدِ معنی کا گنجداں[1] نہ رہا | خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن | اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا ایک ایک کارواں سالار | کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
رونقِ حسن تھا بیاں اُس کا | گرم بازارِ گل رخاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا | قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں | گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہلِ ہند اب کرینگے کس پہ ناز | رشکِ[2] شیراز و اصفہاں نہ رہا
زندہ کیونکر رہیگا نامِ ملوک[3] | بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا | وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا۔ تھا جو مایہ دارِ سخن!
کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن!

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا | اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اس نے ادا | پہ کوئی اسکا حق گذار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں | سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

[1] خزانہ۔ [2] شیراز و اصفہان کی خاک سے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے ہیں گویا وہ سب غالب پر رشک کرتے تھے۔ [3] بادشاہوں۔

نذرِ سائل بھی جان تک لیکن	ق	در خورِ ہمتِ اقتدار[1] نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا		جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی		سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لبِ احباب کے بھی تھا نہ گلہ		دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے		زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست خراب		ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں	آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن[2]	ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک اکثر ہوا ہے بے آئیں	اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی	ڈھونڈتے کیا ہو سیب و رماں[3] میں
حصر تھی اک بیاں میں رنگینی	کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش	گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوشِ معنی شنو[4] ہوا بے کار	مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی	شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

۱ لائق و سزاوار۔ ۲ خانۂ غم وہ حجرہ جس میں حضرت یوسف کے گم ہو جانے کے بعد حضرت یعقوب رہتے تھے۔ ۳ انار۔ ۴ معنی و مطلب سننے والے کان یعنی غالب۔

نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر | سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت
آبِ حیواں پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون | سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سلف | اُن پہ ایمان لائیگا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے | اُس کو دل سے بھلائیگا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش | وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون
اُس سے ملنے کو یاں ہم آئے تھے | جا کے دلی سے آئیگا اب کون
مر گیا قدر دانِ فہمِ سخن | شعر ہم کو سنائیگا اب کون
مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام | ہم کو گھر سے بلائیگا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک | ہم کو چالیں بتائیگا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی | غزل اس کی بنائیگا اب کون

[1] کم لنا فیہ من بکیٍ و عویل
وعتاب مع الزمانِ طویل !

حالی

---

[1] شعر کے لئے ملاحظہ ہو حالات غالب کے بارے میں ہمارا رونا پیٹنا بہت کچھ ہے اور زمانے سے ہم کو بڑی شکایت ہے

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ[1] چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن[2] میں

حسنِ قدیم[3] کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت[4] سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری[5] دی
پروانہ کو تپش[6] دی جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

اقبال

---

۱ جھونپڑی ۲ لباس ۳ خداوند تعالیٰ ۴ تنہائی ۵ خوبصورتی ۶ گرمی جلنا ۷ چہچہی

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو[1] شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو

آفرینش[2] میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی[3] پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

ایک حلقہ پر اگر قایم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں[4] محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے میرے دل میں ہے

تو طلب خو[5] ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو[6] ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل[7]

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں اور سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی[8] سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

اقبال

---

۱ منہ تھکن سے زرد ہو گیا ۲ پیدائش ۳ بدقسمتی ۴ روشن ۵ تیری عادت تلاش کی ہے ۶ سایہ ۷ خدا کا حسن ۸ جاننے کا لطف۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں[1] کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم[2] کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی[3] مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اِس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اسکا کلس ملا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت[4] کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی[5] پریت میں ہے

نانک

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ[6] کی

آہ بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

[1] مندروں [2] مندر اور مسجد [3] غیریت [4] محبت [5] نجات [6] بے مثال موتی۔

آشکار[1] اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ شودر کے لئے ہندوستان غمخانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار[2] میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار[3] میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبال

---

[1] ظاہر کیا [2] غرور کی شراب [3] غیروں کی محفل میں یعنی بدھ مذہب کی تعلیمات سے ہندوستانی نہیں بلکہ چین اور جاپان کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

خواجہ میر دردؔ

دردؔ تخلص۔ خواجہ میر نام سنہ ۱۱۳۳ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ خاندان ان کا دلّی میں بباعثِ پیری مُریدی کے نہایت معزز اور معظم تھا۔

دردؔ اُردو کے چار رکنوں میں سے ایک رُکن ہیں۔ اِن کی غزل سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے۔ مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے۔ گویا تلوار کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا اُنہوں نے کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔

دردؔ کا شمار بارھویں صدی کے اولیاء میں ہوتا ہے تصنیف و تالیف کا انھیں اوّل دن سے شوق تھا جو آخر عمر تک رہا سنہ ۱۱۹۹ھ میں انتقال فرمایا۔ کسی نے تاریخ کہی۔ "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"۔

میر

محمد تقی نام اور میر تخلص ۱۱۳۷ھ میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر عبداللہ شرفائے اکبرآباد میں شمار ہوتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد دہلی تشریف لائے اور یہاں کے باکمال ادیب سراج الدین علی خاں آرزو کے دامن تربیت میں پرورش پائی جس کا اثر ان کی شاعری پر نمایاں ہے۔ زوال دہلی کے بعد لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ مولانا آزاد آبحیات میں فرماتے ہیں:۔

"اس دن کہیں مشاعرہ تھا۔ پتہ معلوم ہوا تو غزل کہہ کر مشاعرے میں پہنچے۔ اُن کی قدیمانہ وضع دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے۔ یہ بیچارے غریب الوطن زمانے کے ہاتھوں سے شکستہ دل اور بھی دل تنگ ہوئے۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع سامنے آئی تو غزل طرحی میں اسی وقت یہ قطعہ پڑھا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

لوگوں کو حال معلوم ہوا تو بہت معذرت کی۔"

جب نواب آصف الدولہ کو میر صاحب کی آمد کا حال معلوم ہوا تو دو سو روپے مہینہ مقرر کر دیا لیکن میر صاحب کی تنگ مزاجی نے

افلاس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ نواب صاحب سے کسی بات پر بگڑ کر دربار کا آنا جانا ترک کر دیا اور فقر و فاقے کے ساتھ خانہ نشین ہو گئے۔ آخر لکھنؤ ہی میں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی ع

واویلا مُرد شہ شاعراں

مولانا آزاد میر صاحب کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ان کی زبان نہایت شستہ۔ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔

ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آبِ حیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ جو غزل کی جان ہے۔

سودا

محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ اُن کے والد مرزا محمد شفیع بطریق تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں دلی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش

پائی۔ پہلے فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ مگر علّامہ خان آرزو کے کہنے سے اُردو زبان میں شاعری شروع کی۔ اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ دلّی جیسے شہر میں ان کی استادی کا خاص و عام نے اقرار کیا۔ شاہ عالم بھی اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔ مرزا مزاج کے تیز اور طبیعت کے غیور تھے۔ کسی بات پر بادشاہ سے بگڑ گئے۔ اس کے بعد ہر چند بادشاہ نے بلوایا لیکن یہ دربار میں نہیں گئے۔

دلّی کی تباہی کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ اُس وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ نواب شجاع الدولہ اور اُن کے بعد نواب آصف الدولہ کی بدولت لکھنؤ میں فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔

سوؔدا اُردو کے مسلّم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اُردو میں قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا سودا کا ہی حصّہ ہے۔

سوؔدا کے کلام میں زبان پر قدرت۔ زورِ کلام۔ مضمون کی بلندی بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی۔ جدّتِ تخیّل کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کلام میں ایسا ہے جیسے کھانے میں نمک۔ اُردو زبان کو پاک صاف کرنے والوں میں اُن کا پہلا نمبر ہے۔ مرزا قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ غزل میں میرؔ کے برابر نہیں۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ میرؔ کا کلام آہ ہے اور سوؔدا کا واہ۔

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشاء تخلص۔ اگرچہ خاندان کے اعتبار سے بھی نامی گرامی شخص تھے۔ لیکن ان کی اپنی ناموری نے باپ کے نام کو بلکہ تمام خاندان کو نئی شہرت سے جلوہ دیا۔ ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں دہلی کے مغلیہ دربار میں شاہی طبیب تھے لیکن سلطنت مغلیہ کے ضعف میں انھیں مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں بھی اعزاز و اکرام سے رہے اور جس طرح اگلے وقتوں کے امیرزادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشا کو سب ضروری علوم و فنون سے ماہر کیا۔ انشاء جیسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوگا۔ وہ اگر علوم میں کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحیدِ عصر گنے جاتے۔ لیکن طبیعت میں شوخی اسقدر تھی کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔

سید انشاء مرشد آباد سے دلّی میں آئے۔ اور شاہ عالم کے دربار میں داخل ہوئے۔ اپنے اشعار کے ساتھ لطائف و ظرائف سے گل افشانی کر کے محفل کو لٹا دیتے تھے۔

جب دلّی سے دل اچاٹ ہوا تو لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے اور وہاں سے نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ملازمت ہوتے ہی ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو

اِن کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ تھا۔ اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے زمین کا پیوند ہوا۔

انشاء کی طبیعت میں ہمیشہ سے اپج تھی۔ اِس لئے تصنیف و تالیف میں پرانی ڈگر چھوڑ کر اپنے لئے نئے راستے نکال لیتے تھے۔ قواعد اُردو کے متعلق ایک فارسی میں کتاب لکھی جس کا نام "دریائے لطافت" ہے۔

داستان رانی کیتکی ایسی لکھی کہ ایک لفظ بھی عربی، فارسی کا نہیں آنے دیا۔ باوجود اِس کے اُردو کے رُتبے سے کلام نہیں گرا۔ غزلوں میں زبان پر قدرت کامل۔ بیان کا لطف۔ محاوروں کی نمکینی ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔

مومنؔ

مومن خاں نام۔ مومنؔ تخلص ۱۲۱۵ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اِن کے والد حکیم غلام نبی خاں شرفائے دہلی میں سے تھے۔ ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ پھر فن حکمت میں جو آبائی پیشہ تھا ...ال حاصل کیا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ سُن لیتے تھے یاد ہو جاتا تھا۔ شاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ اِس کے علاوہ علم نجوم اور شطرنج ...ں دُور دُور تک اِن کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

علم نجوم اور شاعری کو کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ نہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ نہ کسی امیر کی دربارداری کی۔

کوٹھے سے گر کر بازو ٹوٹ گیا تو علم نجوم کی رُو سے حکم لگایا۔ کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ برس میں مرجاؤنگا۔ چنانچہ پانچ ماہ میں مر گئے۔ خود ہی تاریخ کہی۔

دست و بازو بشکست

غزلوں میں ان کے خیالات نازک اور مضامین عاشقانہ ہیں۔ ان کا کلام سوز و گداز کا مخزن ہے جس میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ مقطع میں ہمیشہ اپنے تخلّص کی مناسبت سے نہایت موزوں مضامین لکھتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ غالبؔ و ذوقؔ کے ہمعصر تھے۔ اور اِن استادوں سے اکثر معرکے رہے ہیں۔

ذوقؔ

شیخ ابراہیم ۱۲۰۴ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اِن کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ ذوقؔ کو ابتدائے سِنِ شعور سے شعرگوئی کا چسکا تھا۔ اوّل حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لی۔ پھر دلّی کے مشہور شاعر شاہ نصیر مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ ایک مرتبہ سوداؔ کی غزل پر غزل لکھ کر شاہ نصیر صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنہوں نے ناراض ہو کر

غزل پھینکدی کہ اب استادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھتا ہے۔ ذوق دل شکستہ ہو کر واپس آ گئے اور اس روز کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ذوق کا کلام مقبول عام ہوا اور چند ہی روز میں ان کی رسائی قلعہ میں ہو گئی۔ اکبر بادشاہ کے ولیعہد مرزا ابوظفر جو بادشاہ ہو کر بہادر شاہ کہلائے شعر و سخن کے عاشق تھے اور اپنا کلام میر کاظم حسین بیقرار کو دکھایا کرتے تھے۔ میر صاحب سندھ چلے گئے تو ولیعہد بہادر کی غزلیں بنانے کا کام ذوق کے سپرد ہوا۔ اور قلعہ سے وظیفہ مقرر ہو گیا۔

انیس سال کی عمر میں ذوق کو اکبر شاہ نے خاقانی ہند کا خطاب دیا اور بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

آخر ۱۲۷۱ھ میں ۶۸ سال کی عمر میں دلّی میں رحلت فرمائی۔

ذوق کے کلام کا نمایاں جوہر تازگی مضمون۔ صفائی کلام چستی ترکیب خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔ ہر قسم کے خیال جس رنگ سے چاہتے تھے باندھ جاتے تھے۔ مگر اس طرح کہ دل میں نشتر سا اتر جائے۔ ان کا یہ کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کرتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ ہے کہ کانوں کے رستے پلا دیا۔ سودا کے بعد اردو شاعری میں قصیدہ گوئی کا ذوق پر خاتمہ ہے۔ قصیدے وہ دھوم دھام سے لکھے ہیں کہ بعض اوقات فارس کے شہسواروں سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

انیس

میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن دہلوی مصنف مثنوی بدر منیر کے پوتے سنہ ۱۲۱۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ مرثیہ گوئی ان کا خاندانی فن تھا جس میں باپ ہی کے شاگرد ہوئے۔ ابتدا میں غزل گوئی کا بھی شوق رہا لیکن شفیق باپ نے مرثیہ گوئی کی ترغیب دی جس پر سعادت مند بیٹے نے عمل کیا اور اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ اردو شاعری میں انیس پر مرثیہ گوئی کا خاتمہ سمجھا جاتا ہے۔

ان کے خاندان کی زبان اردوئے معلّیٰ ہونے کے لحاظ سے لکھنؤ میں سند مانی جاتی تھی۔ حسن بیان۔ لطفِ محاورہ۔ کلام کی صفائی اس درجہ ہے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف پیدا کیا ہے۔

۷۴ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی۔ کسی نے کیا خوب تاریخ کہی ہے

طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

اکبر الہ آبادی

اکبر سنہ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی کے علاوہ انگریزی علم و ادب میں کافی دستگاہ تھی۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں وکالت کا ادنیٰ امتحان پاس کیا جس کے

بعد نائب تحصیلدار ہو گئے ۱۸۷۲ء میں وکالت کا اعلیٰ امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کی لیکن بعد میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہو گئے۔ سرکاری خدمات کے صلے میں سرکار سے خان بہادر کا خطاب ملا ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں وفات پائی۔

اکبر کے کلام کا سب سے زیادہ مقبول رنگ ان کی ظرافت ہے جو اصلاح کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ مغربی تہذیب اور موجودہ تعلیم کی بے راہ روی کے خطرناک نتائج کو اکبر کی دوربین آنکھوں نے ایک ربع صدی پہلے دیکھ لیا۔ اور ہندوستانیوں کو ان قبیح نتائج سے آگاہ کیا جن کا اس ترقی کی دوڑ میں رونما ہونا یقینی اور لابدی تھا۔

ان کا کلام سلاست بیان۔ صفائی زبان اور طرز ادا کی شگفتگی کا بہترین نمونہ ہے جس پر ان کی طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی نے قبول عام کی مہر لگا دی ہے۔ عاشقانہ مضامین میں بھی ایک نیا رنگ اور جدت ملتی ہے جو آج تک مقبول خاص و عام ہے۔ اپنی طرز خاص کے موجد تھے۔ جس کی تقلید آج سارا زمانہ کر رہا ہے۔

اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم سیالکوٹ ہی میں پائی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل

ہوئے اور ایم اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی کچھ عرصہ تک اقبالؔ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آخر کار علم کا شوق یورپ لے گیا جہاں بیرسٹری کے علاوہ ایرانی تصوّف کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا جس کے صلہ میں ڈاکٹری کی سند ملی۔

اقبالؔ کو شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی سے تھا اور لاہور کے دَوران قیام میں احباب کی فرمائش پر اکثر مشاعروں اور قومی جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اقبالؔ کے کلام پر اُن کے عمیق مطالعہ اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کا گہرا رنگ موجود ہے۔ یہ اُن چند ایشیائی شاعروں میں سے تھے کہ جو اپنے کلام میں مغربی خیالات کا اظہار نہایت کامیابی کے ساتھ کرتے ہیں۔

اقبالؔ کے اشعار میں شاعرانہ لطافت۔ نازک خیالی۔ سلاستِ بیان کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ مضامین کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ جو اِن کی شاعری کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اور اسی مخصوص طرز کی وجہ سے اقبالؔ کی شہرت ہندوستان کی سرزمین سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل چکی ہے۔

حکومت انگریزی نے اقبالؔ کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف سر کا خطاب عطا فرما کر کیا تھا۔

اقبالؔ کے اُردو کلام کا مجموعہ بانگِ درا۔ بال جبریل اور ضرب کلیم

کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں پیام مشرق۔ زبور عجم۔ مثنوی اسرار و رموز اور جاوید نامہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو لاہور میں انتقال فرمایا اور شاہی مسجد لاہور کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

اس تتمہ میں غالب۔ حالی اور چکبست کے سوانح شامل نہیں کئے گئے۔ ان شعرا کے حالات حصہ نثر میں دیکھو۔